معارف

مئی ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰ روپئے۔ فی شمارہ ۲۵ روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴ روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰ روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰ روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰ روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰ روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری / منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۵ ماہ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۲۰ء عدد ۵

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

کورونا وائرس کی تباہ کاریاں اب بھی جاری ہیں اور لاک ڈاؤن کا سلسلہ بھی ہنوز قائم ہے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کب تک جاری رہے گا۔ اسی حال میں رمضان المبارک کا مقدس مہینہ آ گیا۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس کی برکتوں سے بیش از بیش مستفید اور مالا مال ہونے کی توفیق اور اس کو ان کے حالات میں بہتری کا ذریعہ بنائے، آمین۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس طرح ان دنوں زندگی کے تمام معمولات یکسر بدل گئے ہیں اسی طرح اس سال رمضان بھی بالکل الگ نوعیت کا حامل ہوگا۔ رمضان کے مقدس مہینہ کو کس طرح گزارا جائے اور رمضان سے وابستہ مصروفیات اور عبادات کو کس طرح ادا کیا جائے، اس سلسلہ میں اہم ملی تنظیموں اور علماء کرام کی طرف سے ہدایات بھی جاری کی جا چکی ہیں۔ البتہ بعض نکات پر ہدایات بہت صاف اور واضح نہیں ہیں اور عوام کے دل و دماغ میں ان کی وجہ سے کنفیوژن پیدا ہو سکتا ہے۔ آگے جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے اس کا مقصد مذہبی رہنمائی فراہم کرنا نہیں ہے۔ یہ کام علماء کرام کا ہے اور انہی کو کرنا چاہیے۔ البتہ اتنا کہنا شاید نامناسب نہ ہو کہ ہمارے مذہب میں ضرورت اور حالات کی پوری رعایت رکھی گئی ہے اور ہر طرح کے حالات کے مطابق طرز عمل اپنانے کی گنجائش موجود ہے۔ ماضی میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور اس وقت بھی دنیا کے مختلف مسلم ممالک میں وہاں کے علماء کرام کی رہنمائی اور نگرانی میں ایک واضح موقف پر اتفاق رائے ہو چکا ہے اور وہیں نہیں بلکہ پوری دنیا میں اسی کے مطابق پوری سختی سے عمل کیا جا رہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام وہاں اور یہاں دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ وہاں کے علماء نے موجودہ صورت حال کے پیش نظر کتاب و سنت کی روشنی میں ایک لائحہ عمل طے کیا ہے اور اسی کے مطابق عمل کیا جا رہا ہے۔ اس سے الگ موقف اختیار کرنے کی نہ تو کوئی وجہ ہے اور نہ ضرورت۔ اللہ تعالیٰ نیتوں کا حال خوب جانتا ہے اور اسی کے مطابق فیصلہ فرمائے گا۔ وہ رحیم و کریم ہے اور یہ پسند نہیں فرماتا کہ اس کے بندوں کی جان کو خطرہ لاحق ہو۔ اسلام میں جان کی حرمت کی جو تاکید ہے وہ معلوم ہے۔

جب مسجدیں بند ہیں اور فرض نمازیں گھروں پر ادا کی جا رہی ہیں اور ان کے لیے جماعت کا اہتمام ممکن نہیں رہ گیا ہے تو تراویح جماعت سے کیسے ادا کی جا سکتی ہے۔ موجودہ حالات میں یہ نہایت ضروری ہے کہ اس مرض سے احتیاط کے سلسلہ میں حکومت اور ڈاکٹروں کے ذریعہ جو ہدایات جاری کی گئی ہیں ان پر سختی سے عمل کیا جائے۔ تمام نمازیں بشمول تراویح گھر پر ادا کی جائیں۔ ہر طرح کی

بھیڑ بھاڑ سے احتراز کیا جائے۔سوائے سخت ضرورت کے گھر سے نہ نکلا جائے اور کوئی کام ایسا نہ کیا جائے جس سے اپنی یا دوسروں کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔یہ بات یقینی ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے۔نہ تو اس سے پہلے آسکتی ہے اور نہ اس کے بعد۔اس یقین کے باوجود ہر اس کام سے احتیاط کی جاتی ہے جس سے زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے اور زندگی کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔یہ مرض اسی طرح کا ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔اس کے سامنے اس وقت ساری دنیا سرنگوں ہے اور اس کی قہرمانی کے سامنے بڑی بڑی طاقتیں یکسر بے بس ہیں۔ایسی حالت میں یہ بات دانش مندی کے خلاف ہوگی کہ اس سلسلہ میں کسی بھی قسم کی بے احتیاطی کو راہ دی جائے۔رمضان المبارک کی تمام تر مصروفیات ایسی ہیں جن کو گھر کے اندر سہولت سے انجام دیا جاسکتا ہے۔اب تو جیسے اس قید تنہائی نے روزمرہ کی زندگی کا ایک انداز اور معیار مقرر کردیا ہے۔اسی میں رمضان کی مصروفیات کا اضافہ کرلیجیے۔رمضان نزول قرآن کا مہینہ ہے اسی وجہ سے اس مقدس مہینہ کو اس سے خصوصی نسبت ہے اور اسی لحاظ سے اس کا ہمیشہ اہتمام کیا گیا ہے۔ اس سال اللہ تعالیٰ نے عالمی پیمانے پر رمضان اور اس سے وابستہ مسائل، تقاضوں اور معمولات کو جس اہتمام سے انجام دینے کے اسباب اور امکانات پیدا فرمادیے ہیں ویسا انسانی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ اس سے ممکنہ حد تک فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔اس صورت حال میں بے شمار مسائل کے ساتھ ساتھ غیر معمولی امکانات بھی پوشیدہ ہیں۔مسائل کا حل ہماری دسترس میں نہیں البتہ امکانات اور مواقع سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عنایت فرمائے۔آمین

دارالمصنّفین جب سے قائم ہوا اسے پوری طرح مالی آسودگی شاید ہی کبھی حاصل ہوئی ہو۔ اس کے باوجود اللہ کے فضل و کرم سے اس کی بقا اور اس کے مشن کو جاری رکھنے کے اسباب میسر ہوتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو امت کی اتنی بڑی خدمت کا ذریعہ بنایا۔گذشتہ دنوں مختلف اسباب کی وجہ سے اس کی مالیات کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔اس سے پہلے کہ اس سلسلہ میں کچھ کیا جاتا یہ افتاد پڑ گئی۔صورت حال اس حد تک سنگین ہوگئی کہ وقت پر تنخواہوں کی ادائیگی ممکن نہیں رہی۔حددرجہ مجبوری میں ان سخت حالات میں بھی دارالمصنّفین کے بہی خواہوں کو اس طرف متوجہ کرنا پڑا۔یہ دارالمصنّفین سے محبت اور اس کی اہمیت کے احساس کا یہ غیر معمولی مظہر ہے کہ ان حد درجہ نامساعد حالات میں بھی بہت سے کرم فرماؤں نے اس طرف فوری طور پر توجہ دی اور

آن لائن ٹرانسفر کی سہولت کی وجہ سے ان کے عطیات اکیڈمی کو موصول ہو گئے۔ کئی جگہوں پر احباب ابھی اس سلسلہ میں کوشش کر رہے ہیں جس کے نتائج بعد میں ظاہر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کرم فرماؤں کو اس کے لیے بہترین اجر سے نوازے، آمین۔ اس طرح وقتی طور پر تو مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا البتہ یہ ضروری ہے کہ آئندہ کے لیے کوئی باقاعدہ حکمت عملی اختیار کی جائے اور اس سلسلہ میں کوئی قابل عمل منصوبہ تیار کیا جائے۔ اس کی ضرورت خاص طور پر اس لیے بھی ہے کہ لاک ڈاؤن ختم ہونے کے بعد بھی معاشی حالات ایک مدت تک متاثر رہیں گے۔ وہ تمام حضرات جن کو دارالمصنّفین کے مقاصد سے اتفاق ہے اور جو سمجھتے ہیں کہ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اسے باقی اور جاری رہنا چاہیے ان سے درخواست ہے کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور فرمائیں اور کوئی قابل عمل لائحہ عمل اس سلسلہ میں تجویز فرمائیں۔ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور اس کی طرف توجہ از حد ضروری ہے۔

لاک ڈاؤن کا وقت جیسے جیسے بڑھتا جا رہا ہے کمزور اور مظلوم طبقات کی مشکلات میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ اس سلسلہ میں معاشرہ کے حساس طبقات شروع ہی سے سرگرم عمل ہیں اور لوگوں کی مشکلات کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ وقفہ طویل ہوتا جا رہا ہے اور ضرورت بہت زیادہ ہے اس لیے وسائل کی کمی بھی راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود یہ سول سوسائٹی کا فرض ہے کہ منصوبہ بند طریقہ پر اس ضروری کام کو مذہب و ملت کی کسی تخصیص کے بغیر جاری رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور محروم طبقات کی دادرسی میں کمی نہ ہونے دی جائے۔ رمضان المبارک میں یوں بھی جذبۂ انفاق میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے اور دوسروں کی تکلیف اور مصیبت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر توجہ کی ضرورت ہے۔ بارگاہ رب العزت میں دعا ہے کہ ان مشکلات کو آسان فرمائے۔ خاص طور سے اس وقت ہندوستان کی ملت اسلامیہ جن مسائل اور مشکلات سے دوچار ہے ان سے رستگاری کے اسباب پیدا فرمائے۔ وما ذلك على الله بعزيز

لاک ڈاؤن کی وجہ سے گذشتہ مہینہ کا معارف صرف آن لائن شائع کیا جا سکا ہے۔ یہ شمارہ بھی آن لائن ہی شائع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی اور حالات و وسائل نے ساتھ دیا تو انشاء اللہ حالات کے معمول پر آنے کے بعد اسے عام قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔

مقالات

تفسیر القرآن (سرسید) ایک مطالعہ

جناب الطاف احمد اعظمی ☆

(۲)

چوتھی خصوصیت: ''تفسیر القرآن'' کی چوتھی خصوصیت تحقیق وتفحص کا اہتمام ہے۔قرآن مجید میں قوم یہود کے کئی انبیا اور سلاطین کا ذکر اجمالاً ہوا ہے، ان کی تفصیل کے لیے کتب مقدسہ کی مراجعت ناگزیر ہے۔اس سلسلے میں بہت سے مفسرین نے بڑی سہل پسندی کا ثبوت دیا ہے۔انہوں نے بہت سے غیر معتبر واقعات اور مذہبی روایات کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا ہے۔اس کے برعکس سرسید کا رویہ ایک دیدہ ور محقق کا سا ہے۔انہوں نے اس نوع کے تمام واقعات کی تحقیق کتب مقدسہ اور یہود کے دوسرے مذہبی صحائف کی مدد سے نہایت باریک بینی سے کی ہے۔ہم اس کی چند مثالیں سورۂ بقرہ کی تفسیر سے پیش کرتے ہیں۔

آیت: ۲۴۳ (اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَهُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ) کی تشریح میں سرسید لکھتے ہیں: ''(اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا)'' اس آیت سے نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کن لوگوں کا ذکر ہے۔مفسرین نے لفظ ''موتوا'' اور لفظ ''احیاء'' سے یہ قیاس کیا کہ یہ لوگ حزقیل نبی کے وقت میں تھے۔حزقیل نبی کا ایک قصہ مردوں کی ہڈیوں کے دیکھنے اور پھر ان کے زندہ ہونے کا حزقیل نبی کی کتاب میں مندرج ہے۔ہمارے ہاں کے مفسروں نے صرف ان دو لفظوں سے ایک قصہ مثل قصہ حزقیل بنالیا ہے جو محض غلط ہے اور ''حذر الموت'' کے لفظ سے انہوں نے وبا سے ان لوگوں کا اپنا ملک چھوڑ کر جانا قرار دیا ہے مگر اس تفسیر کی کوئی سند نہیں ہے، صرف اسی غلط خیال پر یہ تفسیر بیان کی ہے۔

''حذر الموت'' کے لفظ سے بہ سبب وبا کے ان لوگوں کا ملک سے چلا جانا ایک نہایت

☆ آر، زیڈ۔B-901، فلیٹ نمبر ۴۰۲، لین نمبر ۴، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی۔۱۱۰۰۱۹۔

غلط قیاس ہے کیوں کہ اسی مقام پر خدا نے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں سے لڑنے کی ترغیب دی ہے اور اس لیے لڑائی میں مارے جانے کے خوف سے ان لوگوں کا ملک کو چھوڑ کر چلا جانا مراد ہوسکتا ہے نہ کہ وبا کے ڈر سے۔

موت اور احیا کے حقیقی معنی بھی یہاں مراد نہیں ہوسکتے۔ کیوں کہ آیت میں کوئی اشارہ اس بات کا کہ یہ معجزہ سے ہوا تھا اور کیا محل معجزہ دکھانے کا تھا اور کس پیغمبر نے دکھایا تھا اور کس کو دکھایا تھا، مذکور نہیں ہے اور چونکہ یہ الفاظ موقع جنگ میں واقع ہیں اس لیے موت سے ان لوگوں کی نامردی اور بزدلانہ پن ہے جو لڑائی میں موت کے ڈر سے ملک چھوڑ گئے تھے، جیسے کہ عام محاورہ میں کہتے ہیں کہ اگر یہ بات نہیں کرتے تو اچھا مرو یعنی مصیبت میں پڑے رہو۔ خدا نے اور بھی جگہ موت کے لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ ''قل موتوا بغیظکم'' یعنی اپنے غصہ میں مرو یعنی تباہ و خستہ دل رہو، اور احیا کے لفظ سے ان کے دل میں قوت آنا اور لڑنے پر آمادہ ہونا اور دشمن کو شکست دینے پر قادر ہونا ہے اور اسی تمثیل پر مسلمانوں کو دوسری آیت میں دشمنوں سے لڑنے اور دل کو مضبوط رکھنے کی ترغیب دی ہے، پس موت و احیا سے حقیقی موت و زندگی سمجھنا اور تمام قصہ کی حزقیل نبی کے فرضی قصہ پر جو حزقیل کی کتاب میں ہے، محمول کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔(۲۱)

''حذر الموت'' کی عالمانہ وضاحت کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں: ''بلاشبہ جب کہ قرآن مجید میں ان لوگوں کا زیادہ حال بیان نہیں ہوا ہے تو مفسر کا صرف یہ کام ہے کہ تاریخی گزشتہ واقعات پر خیال کرے اور دیکھے کہ کون سے تاریخی واقعہ سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے اور کوئی قرینہ اس واقعہ سے آیت کے متعلق کرنے کا ہے یا نہیں اور اس طرح آیت کا تعلق اس واقعہ سے قرار دے۔ اس مقام پر قرآن مجید میں ان واقعات کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل اور مدیانیوں اور فلسطینیوں میں واقع ہوئے تھے اور اس لیے قیاس کرنے کو صریح موقع ہے کہ اس آیت میں بھی انہی واقعات میں سے کسی واقعہ کا ذکر ہے۔

مدیانیوں (تورات، کتاب قضاۃ، باب ششم) کے ہاتھ سے بنی اسرائیل نے سخت شکست پائی تھی اور اپنا گھر چھوڑ چھوڑ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں بھاگ گئے تھے اور سات برس تک ان پر یہ مصیبت رہی، پھر جدعون نبی ان میں مبعوث ہوئے اور انہوں نے ان کو لڑائی پر ترغیب دی اور ان کا

دل مضبوط کیا اور مدیانیوں پر انہوں نے فتح پائی۔ پس خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو بتایا کہ جو لوگ لڑائی میں موت کے ڈر سے بھاگے وہ ایسی بدتر حالت کو جو مرنے کے برابر ہے پہنچ گئے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمت و جرأت سے زندہ کیا اور فتح مند و خوش حال ہوئے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی موت کے ڈر سے بزدلی و نامردی جو موت کے برابر ہے اختیار کرنی نہیں چاہیے، بلکہ اپنے دشمنوں سے لڑنا اور بہادری و دلیری و استقلال کو کام میں لانا چاہیے"۔ (۲۲)

آگے کی آیات (۲۴۵ تا ۲۵۱) میں جس تاریخی واقعے کا ذکر ہے اس کا تعلق طالوت اور جالوت کی لڑائی سے ہے لیکن اس مختصر بیان سے نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طالوت اور جالوت کون تھے، جن نبی اللہ کے زمانہ میں یہ لڑائی ہوئی ان کا نام کیا تھا؟ طالوت اور جالوت میں لڑائی کس مقام پر ہوئی، دریا عبور کرتے وقت پانی پینے کی ممانعت کی غرض کیا تھی، داؤد کون تھے جنھوں نے میدان جنگ میں جالوت کو قتل کیا اور ان کو بادشاہت کس طرح حاصل ہوئی؟ ان سب امور کی وضاحت متقدمین مفسرین نے ضرور کی ہے لیکن اس میں دور از کار بحثیں زیادہ ہیں۔ سرسید نے بنیادی تاریخی اور مذہبی مآخذ کی روشنی میں مذکورہ تاریخی واقعے کی تمام جزئیات کی تحقیق و تفصیل جس خوبی سے کی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ لکھتے ہیں:

"(اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ) اس آیت سے لغایت آیت ۲۵۱: طالوت اور جالوت کی لڑائیوں کا ذکر ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ بنی اسرائیل میں شموئیل نبی تھے اور ان آیتوں میں پانچ واقعوں کا بیان ہے: ۱۔ بنی اسرائیل کا اپنے نبی سے درخواست کرنا کہ ان پر کوئی بادشاہ مقرر کرے ۲۔ شموئیل نبی کا بنی اسرائیل پر طالوت کو بادشاہ مقرر کرنا ۳۔ تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد میں بنی اسرائیل کے پاس آجانا ۴۔ طالوت کے لشکر کو دریا کے پانی پینے سے منع ہونا ۵۔ فلسطینیوں کا شکست پانا اور جالوت کا داؤد کے ہاتھ سے مارا جانا۔ یہ تمام واقعات توریت کی کتاب شموئیل میں مندرج ہیں مگر تیسرے اور چوتھے واقعہ میں کسی قدر اختلاف ہے یعنی کتاب شموئیل میں تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد سے پہلے آجانا لکھا ہے اور قرآن مجید میں طالوت کے عہد میں اور اس پر عیسائی مورخوں نے اعتراض کیا ہے کہ غلطی سے ماقبل واقعے کو مابعد کے واقعے میں شامل کر دیا ہے۔

کتاب شموئیل سے پایا جاتا ہے کہ تابوت سکینہ بمقام شیلوہ تھا، جہاں عیلی بنی اسرائیل پر

حاکم تھا، اس کے عہد میں بنی اسرائیل اور فلسطینیوں میں بمقام ابن عیذر لڑائی ہوئی اور بنی اسرائیل کی شکست ہوئی (دیکھو کتاب شموئیل ا، باب ۴، ورس ۲)، تب بنی اسرائیل نے تابوت سکینہ کو شیلوہ سے لشکرگاہ میں منگایا اور دوبارہ لڑے اور شکست عظیم ہوئی اور عیلی کے دونوں بیٹے مارے گئے اور تابوت سکینہ کو فلسطینی چھین لے گئے، (دیکھو شموئیل ا، باب ۴، ورس ۱۰ و ۱۱) عیلی بھی یہ خبر سن کر کرسی پر سے گر پڑا اور مر گیا، اس زمانہ میں شموئیل نبی ہو چکے تھے مگر ان کی عمر چھوٹی تھی۔

فلسطینی تابوت سکینہ کو مقام ابن عیذر سے جہاں سے انہوں نے فتح کیا تھا بمقام اشدود لے گئے اور واگون بت کے مندر میں رکھا (دیکھو کتاب شموئیل ا، باب ۵، ورس الغایت ۵) پھر وہاں سے بمقام گت لے گئے (دیکھو کتاب مذکور، ورس ۸) پھر وہاں سے بمقام عقرون لے گئے، (دیکھو کتاب مذکور، ورس ۱۰) اس کے بعد فلسطینیوں نے ایک گاڑی میں دو گایوں کو جوت کر اور تابوت سکینہ کو اس پر رکھ کر جنگل میں چھوڑ دیا اور وہ گائیں اس کو لے کر بمقام بیت الشّمس چلی آئیں اور یوشع کے کھیت میں جا کھڑی ہوئیں، اس نے تابوت اتار لیا اور اپنے ہاں رکھا، (دیکھو شموئیل ا، باب ۶) کتاب شموئیل میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کی شکست ہونے اور تابوت چھن جانے کے سات مہینہ بعد ہوا۔

اس کے بعد تابوت سکینہ قریات یعاریم میں آیا اور ابیناداب کے گھر میں بمقام گبعاہ رکھا گیا (دیکھو کتاب شموئیل ا، ب ۷، ورس ۱) مگر کتاب شموئیل میں نہیں لکھا کہ بیت الشّمس میں کس قدر مدت رہا، عیسائی مورخوں کے نزدیک ۱۱۴۱ قبل مسیح کے تابوت سکینہ فلسطینیوں نے چھین لیا تھا اور ۱۱۴۰ قبل مسیح میں قریات یعاریم میں آ گیا، وہاں آنے کے بیس برس بعد یہودیوں نے بتوں کی عبادت شموئیل نبی کی فہمائش سے موقوف کی اور خدا کی پرستش اختیار کی (دیکھو کتاب شموئیل ا، باب ۷، ورس ا و ۲) اور بنی اسرائیل سے شموئیل کی سرداری میں ایک لڑائی فلسطینیوں سے ہوئی اور فلسطینیوں سے شکست کھائی۔ جب شموئیل ضعیف ہوئے تب بنی اسرائیل نے کسی بادشاہ کے مقرر کرنے کو کہا اور طالوت کو ۱۰۹۵ قبل مسیح میں بادشاہ کیا۔

کتاب شموئیل میں طالوت یعنی شاؤل اور جالوت کی لڑائی اور اس کے مارے جانے کا ذکر ہے مگر طالوت کے لشکر کو دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ توریت کی کتاب قضاۃ، باب ہفتم میں جدعون کے لشکر کو ایک چشمہ کا پانی پینے سے منع کیا گیا تھا اور یہ واقعہ ۱۲۴۰ قبل مسیح کے

ہوا تھا، اس لیے عیسائی مورخ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقعہ کو طالوت کے لشکر سے سے ملا دیا ہے۔

ان دونوں اعتراضوں کے تسلیم کرنے کے لیے جو مخالفت کتاب شموئیل پر مبنی ہیں، ضرور ہے کہ کتاب شموئیل میں جو واقعات اور جو ترتیب ان واقعات کی ہے ان کو صحیح تسلیم کرلیا جائے اور یہ بات بھی مان لی جاوے کہ کوئی واقعہ طالوت کے لشکر کا ایسا نہیں ہے جو کتاب شموئیل میں لکھنے سے رہ گیا ہو، حالاں کہ خود عیسائی مورخ ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے، شموئیل کی کتابوں کے مضامین میں باہم اختلاف ہے، کتاب اول شموئیل، باب ۱۶، ورس ۲۱ و ۲۲ سے ظاہر ہے کہ طالوت داؤد سے اور اس کے باپ یسٰی سے بخوبی واقف تھا، داؤد کو اس کے باپ کے پاس بلایا تھا اور اپنا سلحدار کیا تھا، اس کتاب کے باب ہفدہم، ورس ۱۵ سے ظاہر ہے کہ داؤد طالوت سے رخصت ہوکر اپنے گھر چلا گیا تھا، لڑائی کے ہنگامہ میں جب داؤد اپنے بھائیوں کی خبر لینے آیا تو داؤد نے کہا کہ جالوت سے میں لڑوں گا، یہ خبر سن کر طالوت نے داؤد کو بلایا اور گفتگو کے بعد لڑنے کی اجازت دی اور اپنی زرہ وخود و تلوار بھی دی جس کو داؤد نے لے کر پھر دے دیا (دیکھو کتاب اول شموئیل، باب ۱۷، ورس ۳۱، لغایت ۳۹) مگر اسی باب کے ورس ۵۵ میں لکھا ہے کہ جب داؤد لڑنے کو بڑھا تو طالوت نے اپنے لشکر کے سردار سے پوچھا کہ یہ جوان کس کا بیٹا ہے اور ورس ۵۸ میں لکھا ہے کہ جب داؤد نے جالوت کا سر کاٹ لیا اور طالوت کے پاس لے آیا تو طالوت نے پوچھا کہ تو کس کا بیٹا ہے، پس آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک طالوت داؤد سے مطلق واقف نہ تھا۔

اس اختلاف کے سبب خود عیسائی مورخوں کی یہ رائے ہے کہ کتاب شموئیل میں قصہ الٹ پلٹ ہوگیا ہے، جالوت کی لڑائی کے بعد داؤد طالوت کا مصاحب اور سلح دار رہا ہے، اس پر بھی اختلاف رفع نہیں ہوتا کیوں کہ سولھویں باب سے داؤد کی پہلی دفعہ بطور مطرب بربط نواز کے طالوت سے ملاقات ہونی پائی جاتی ہے۔

متقدمین علمائے عیسائی نے خیال کیا ہے کہ باب ہفت دہم، کتاب اول شموئیل کے ورس ۱۱، لغایت ۳۱، ورس ۵۵ و باب ہیجدہم کے ورس ۱، لغایت ۵ صحیح نہیں ہیں اور ان کو خارج کردیا ہے، چنانچہ سپٹو ایجنٹ کے قلمی نسخہ وٹیکن میں وہ آیتیں نہیں ہیں اور اگر وہ آیتیں نکال ڈالی جاویں تب بھی اور

آیتوں میں جیسے کہ باب ۱۶؍کے ورس ۱۸؍لغایت ۲۱ و باب ۱۷؍کے ورس ۳۲؍لغایت ۴۰ کی مطابقت ہی نہیں ہوسکتی، انہی اختلاف کے سبب بعض عیسائی عالموں کی یہ رائے ہے کہ سارے کا سارا ستر ہواں باب الحاقی و نامعتبر ہے۔ جان کیٹو نے اپنی کتاب ''انسائیکلو پیڈیا'' (احصاء العلوم) میں لکھا ہے کہ ''یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اسے الحاقی سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلاکم و کاست صحیح جانیں کیوں کہ ممکن ہے کہ جنہوں نے الحاق کیا تھا، انہوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو''۔

علاوہ اس کے یہ بھی تحقیق نہیں ہے کہ شموئیل کی کتابیں کب لکھی گئیں اور کس نے لکھی ہیں، یہودی اور بڑے بڑے عیسائی عالم خیال کرتے ہیں کہ شموئیل کی کتاب کا بڑا حصہ یا پہلے چوبیس باب شموئیل کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی ناتان نبی و گید نبی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ابربانیل اور کروشیس خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کتابیں یرمیاہ نبی نے لکھی ہیں، جان کی یہ رائے ہے کہ یہ کتابیں شموئیل کے بہت زمانہ بعد یعنی قید بابل کے تیسویں سال میں لکھی گئی ہیں، اگر درحقیقت ایسا ہی ہو کہ تین ہاتھوں نے ان کتابوں کو لکھا ہو تو واقعات کا الٹ پلٹ ہوجانا یا بعض واقعات کا تحریر سے رہ جانا ایک ایسا امر ہے جو آسانی سے خیال میں آسکتا ہے۔

ہماری غرض اس بحث سے شموئیل کی کتابوں پر جرح وقدح نہیں ہے بلکہ صرف یہ بات ثابت کرنی ہے کہ قرآن مجید پر اس وجہ سے کہ شموئیل کی کتابوں سے بیان میں مختلف ہے، اعتراض نہیں ہوسکتا جب تک کہ اور طرح پر اس کی غلطی ثابت نہ کی جاوے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ قرآن مجید میں جو کچھ لکھا ہے اس کی صحت پر کسی کو اس وجہ سے مجبور کروں کہ قرآن میں لکھا ہے، بلکہ میں دونوں واقعوں پر جو قرآن و کتاب شموئیل میں مندرج ہیں بطور ایک نکتہ چیں مورخ کے غور کرنا اور اس نکتہ چینی سے دونوں قولوں میں سے ایک کو ترجیح دینا چاہتا ہوں۔

تابوت سکینہ کو فلسطینی فتح کر کے چھین لے گئے تھے، کتاب شموئیل میں اس کا واپس بھیج دینا ایسے عجیب اور کراماتی واقعوں پر مبنی کیا ہے جس کو کوئی آزاد رائے کا مورخ جو واقعات کو انسانوں کے حالات اور افعال کا نتیجہ سمجھتا ہے تسلیم نہیں کرسکتا۔ لڑائی کی شکست ہونے کے بعد بنی اسرائیل نہایت ضعیف ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ انہوں نے پھر قوت حاصل کی تھی، تابوت سکینہ کا دشمنوں کے ہاتھ میں چلا جانا بلاشبہ ان کو نہایت رنج دیتا ہوگا اور ان کی نہایت آرزو یہ ہوگی کہ وہ اس کو پھر اپنے دشمنوں سے

واپس لیں۔

اس شکست کے بیس برس بعد وہ فلسطینیوں سے پھر لڑے اور فلسطینیوں نے شکست پائی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسطینی کمزور ہوگئے تھے۔ فلسطینی خوب جانتے ہوں گے کہ بنی اسرائیل جب تک کہ تابوت سکینہ ان کے ہاتھ نہ لگے لڑائی سے باز نہیں آنے کے، اس عرصہ میں بنی اسرائیل کو زیادہ قوت ہوگئی اور شموئیل نبی نے تمام فرقوں کو جو عیلی کے مرنے کے بعد متفرق ہوگئے، اکٹھا کرلیا اور طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور یہ امر بنی اسرائیل کی زیادہ قوت کا اور فلسطینیوں کو جو کمزور ہوتے جاتے تھے زیادہ خوف کا باعث ہوا ہوگا۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ اگر تابوت سکینہ واپس کردیا جائے تو شاید مصیبت جنگ سے حفاظت ہوجاوے، انہوں نے جا بجا اس کو منتقل کیا اور آخر ایک گاڑی میں لاد کر مع زر و تحائف کے بیت الشّمس کی سرحد میں جو بنی اسرائیل کا ایک شہر فلسطینیوں کی سرحد سے ملا ہوا تھا، چھوڑ آئے اور اس تمام اصلی واقعہ پر خیال کرنے سے اس بات کو کہ تابوت سکینہ طالوت کے عہد میں آیا ہوگا، جیسا کہ قرآن میں مندرج ہے، زیادہ ترجیح ہوتی ہے۔

دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کی نسبت اول ہم کو خیال کرنا چاہیے کہ جہاں طالوت و جالوت میں لڑائی ہوئی تھی وہ کیا مقام تھا، فلسطینی مقام سوکوہ و غریقا و آفس ومیم میں جمع ہوئے تھے اور بنی اسرائیل وادی ایلاہ میں، دونوں لشکروں کے درمیان دریائے شورق واقع تھا، فلسطینی اس کے بائیں کنارے پر یعنی جانب شمال تھے اور بنی اسرائیل نے دریا کو عبور کرکے فلسطینیوں پر حملہ کیا تھا، پس قرآن مجید کے ان لفظوں کی کہ ''اِنَّ اللّٰہَ مُبۡتَلِیۡکُمۡ بِنَہَرٍ'' جغرافیہ اور تاریخ جغرافیہ سے بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔

باقی رہا اس کے پانی پینے سے منع کرنا، ہر شخص جو لڑائیوں کے حالات سے واقف ہے اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر فوج کشی کرتی ہے تو ہر ایک شخص اس کی قوم کا بہادر اور غیر بہادر اور دل چلا اور دل کا بودا قومی لحاظ سے اس کے ساتھ ہولیتا ہے لیکن جب وقت حملہ کرنے کا آتا ہے تو سپہ سالار ایک طریقہ ایسے لوگوں کے انتخاب کرنے کا مقرر کرتا ہے جس کے سبب حملہ میں وہی لوگ شریک رہیں جو نہایت بہادر اور دل چلے ہوں اور درحقیقت اپنے دلی جوش سے لڑائی میں شریک ہوئے ہوں۔

جب جدعون نے مدیانیوں پر فوج کشی کی تھی تو اس نے حملہ کے وقت یہ قرار دیا تھا کہ جو شخص اس چشمہ سے جو اس کے لشکر کے پاس تھا، پانی پی لے وہ حملہ میں شریک نہ ہو اور جو نہ پیے بلکہ صرف ہاتھ بھگو کر زبان کو تر کر لے وہ حملہ میں شریک رہے، اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ جن لوگوں کو لڑنے اور جان دینے میں تذبذب ہو وہ چھٹ جائیں اور جو بالکل لڑنے اور مرنے پر آمادہ ہوں وہ حملہ میں شریک رہیں۔

اگرچہ شبہ ہے کہ جہاں جدعون کی مدیانیوں سے لڑائی ہوئی تھی، وہاں کوئی چشمہ نہیں تھا اور اس لیے کتاب القضاۃ میں طالوت کا واقعہ جدعون سے ملا دیا ہے، لیکن اگر اس کو جدعون ہی کے وقت کا واقعہ تسلیم کرلیا جاوے تو طالوت کو یہ واقعہ ضرور معلوم ہوگا اور اتفاق سے طالوت کا لشکر بھی دریا کے کنارہ پر پڑا تھا اور دریا کے پار اتر کر حملہ کرنا قرار پایا تھا، ہر طرح پر یقین کرنے کا موقع ہے کہ طالوت نے بھی اسی طریقہ پر ان لوگوں کا جو حملہ میں دل سے شریک ہونے کو تھے انتخاب کرنا چاہا ہوگا اور وہی طریقہ انتخاب کا اختیار کیا ہوگا جو جدعون نے اختیار کیا تھا، ہاں کتاب شموئیل میں اس انتخاب کا ذکر نہیں ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کتاب شموئیل میں اس کا ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ واقعہ نہ ہوا ہو، عیسائی مورخوں نے کج بحثی سے یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن مجید میں جدعون کے قصہ کو طالوت کے قصہ میں ملا دیا ہے، پس یہ اعتراض کرنے والوں کی غلطی ہے، کیونکہ تمام واقعات کو خیال کرنے سے اس بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ جدعون کے عہد میں جو واقعہ ہوا وہ علاحدہ ہے اور طالوت کے عہد میں جو واقعہ ہوا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ علاحدہ ہے اور کم سے کم اس میں تو کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ اس زمانہ کے یہود جب قرآن مجید نازل ہوا، اس واقعہ کا طالوت کے عہد میں بھی واقع ہونے کا یقین رکھتے تھے، کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو انہی کے مقابلہ میں قرآن مجید میں علانیہ ایسا بیان نہیں ہوسکتا تھا۔(۲۳)

اس طویل تاریخی بحث سے ٹھیک متصل ہی ایک اور تاریخی واقعے پر نہایت عمدہ بحث کی گئی ہے، اگرچہ خوفِ طوالت دامنگیر ہے لیکن چونکہ یہ بحث تاریخی اور نحوی دونوں اعتبار سے بے حد اہم ہے، اس لیے اس کی تفصیل نہایت ضروری ہے، اس بحث کا تعلق آیت ۲۵۹ سے ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا	”یا اس کی مثال (یعنی اللہ کس طرح اپنے نیک بندوں کی مدد کرتا ہے اور ان کی قلبی بے اطمینانی دور کرتا ہے)

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ الخ
(سورۂ بقرہ:۲۵۹)

ایسی ہے جیسے وہ شخص جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں کے بل گری پڑی تھی، اس نے (یہ منظر دیکھ کر) کہا، اللہ اس مردہ بستی کو کس طرح زندہ کرے گا (یعنی ویران ہونے کے بعد یہ کیونکر آباد ہوگی؟) اللہ نے (اس کے جواب میں) اسے سو سال تک مردہ رکھا، پھر اس کو اٹھایا اور پوچھا: کتنی مدت اس حال میں رہے، اس نے کہا ایک دن یا کچھ کم، فرمایا (تمھیں کچھ خبر نہیں) تم سو سال اسی حالت میں رہے ہو"۔

مذکورہ آیت کے ابتدائی فقرہ "او کالذی" میں حرف کاف جو حرف تشبیہ ہے، مفسرین اور اصحاب نحو کے درمیان زیر بحث رہا ہے لیکن ان کا کسی ایک معنی پر اتفاق نہیں ہوا، اردو مفسرین نے حسب عادت اس بحث سے صرف نظر کیا ہے، صاحب تدبر قرآن نے حرف "او" کی وضاحت یہ کی کہ یہ تقسیم کے لیے آتا ہے،(۲۴) لیکن حرف کاف سے بحث نہیں کی، حالانکہ آیت کے معنی مراد کی تعیین کے لیے اس پر بحث ضروری تھی۔ سر سید نے اس آیت کے معنوی اجمال کو جس خوبی سے کھولا ہے اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید ہی کی طرح یہود کے مذہبی صحائف پر بھی نظر غائر رکھتے تھے وہاں یہ بھی آشکار ہوتا ہے کہ وہ عربی اور اصحاب نحو کی قواعدی بحثوں سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔

سر سید "اَوْ كَالَّذِىْ" کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"(اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ) قبل اس کے کہ اس کی تفسیر بیان کی جاوے لفظ "كَالَّذِىْ" میں جو حرف کاف ہے، اس پر جو بحث ہے وہ بیان کرنی چاہیے، علمائے نحو میں سے کسائی اور فرّا اور ابو علی فارسی کا یہ قول ہے کہ اس سے پہلی آیت میں جہاں فرمایا ہے کہ "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ" وہاں بھی "والذی" کی جگہ "کالذی" مراد ہے اور پھر اس آیت میں جو "اَوْ كَالَّذِىْ" آیا ہے اس کا عطف پہلی آیت کے معنوں پر ہے، نہ لفظ پر۔ یہ بحث تو صرف سیاق عبارت سے اور ایک نحوی قاعدہ سے متعلق ہے، اس بحث سے یہ مطلب حل نہیں ہوتا کہ "الذی" پر کاف تشبیہ لانے سے جو یہ معنی ہو گئے ہیں کہ "اس شخص کی مانند" تو مانند کہنے سے کیا مطلب ہے، اخفش نے اس بحث کو نہایت مختصر

کرلیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہاں کاف زائد ہے، مگر کاف زائد کے لانے کی اور اس کے زائد ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، صاف بات یہ تھی کہ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ ''کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا'' اور دوسری آیت میں فرمایا کہ ''کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جو ایک قریہ میں گزرا'' کہنے کی کیا حاجت تھی، مبرد نحوی دوسری آیت میں چند لفظ محذوف مانتا ہے اور اس کا قول ہے کہ تقدیر آیت کی یوں ہے ''والم تر من کان کالذی مرعلی قریۃ'' یعنی تو نے کیا نہیں دیکھا اس شخص کو جو تھا مثل اس شخص کے جو ایک قریہ پر گزرا، مگر اس سے بھی آیت کا مطلب نہیں کھلتا اور یہی سوال باقی رہتا ہے کہ مثل اس شخص سے کیا مطلب ہے۔

صاحب بیضاوی نے غالباً ان مشکلات کو خیال کیا ہے اور ایک اور قول بیان کرنے سے اپنی دانست میں اس مشکل کو حل کیا ہے اور لکھا ہے کہ (اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ) حضرت ابراہیمؑ کا قول ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے، یعنی جب نمرود نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ''میں زندہ کرتا ہوں'' تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ اگر تو زندہ کرتا تو اس طرح زندہ کر جس طرح کہ خدا نے اس شخص کو زندہ کیا تھا جو ایک قریہ پر گزرا تھا، اس تفسیر کے مطابق تقدیر آیت کی یہ ہوتی ہے کہ ''ان کنت تحیي فاحیي کاحیاء اللہ الذی مر علی قریۃ'' نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ لفظ کاف سے اس شخص کی مانند مراد نہیں بلکہ جس طرح وہ زندہ ہوا تھا، اس طرح زندہ کرنے کی مانند مراد ہے اور پھر قاضی بیضاوی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو زندہ ہوا تھا یا تو عزیر تھے یا خضر تھے، یا کوئی کافر منکر بعثت تھا، عزیر تو ہو نہیں سکتے کیوں کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ کے بہت بعد ہوئے ہیں اور یہ معلوم نہیں کہ قاضی صاحب نے خضر سے مراد کس سے لی ہے اور یہ واقعہ خضر پر کب گزرا تھا اور نہ یہ معلوم کہ وہ کافر منکر بعثت کون تھا، رجماً بالغیب جو کچھ جی میں آیا یا سنا لکھ دیا، راوی کی روایت (گو وہ کیسی ہی صریح البطلان ہو) تفسیروں میں قصوں کے لکھ دینے کو کافی ہے، پس یہ قول حضرت ابرہیمؑ کا کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

اگر قرآن مجید کا ٹھیک ٹھیک ادب کیا جاوے اور اس کو دیو پری کا قصہ نہ قرار دیا جاوے جیسے کہ عجائب پسند مسلمان قرار دیتے ہیں تو آیت کے معنی نہایت صاف ہیں۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ ''کاف'' حرف تشبیہ کا ہے اور ''کانّ'' بھی اسی کاف تشبیہ سے بنا ہے اور کاف تشبیہ کو بہ سبب کسی ضرورت کے مثلاً بغرض اہتمام تشبیہ یا تبدیل سیاق کلام یا کسی اور ضرورت کے مشبّہ بہ سے جدا کر کے

مقدم کردینا جائز ہے، مثلاً ''زید کالاسد'' سے جب کاف تشبیہ کو کسی سبب سے جدا کر کے مقدم کریں تو یوں کہیں گے ''کان زید کالاسد'' اس مقام پر بھی ''الذی'' مشبہ بہ نہیں ہے بلکہ اس سے اس شخص کے مرور کی تشبیہ یا تمثیل مراد ہے، پس تقدیر آیت کی یہ ہے کہ ''الم تر الی الذی کانہ مر علی قریۃ'' یعنی کیا نہیں دیکھا تو نے اس شخص کو جو گویا کہ گزرا تھا ایک قریہ پر، درحقیقت وہ شخص گزرا نہیں تھا بلکہ اس نے رویا میں دیکھا تھا کہ میں ایک قریہ پر گزرا ہوں جو ویران پڑا ہے اور جو تقدیر آیت کی ہم نے بیان کی ہے اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس شخص کا حال بیان کیا جاتا ہے کہ وہ رویا کا واقعہ ہے مگر نحوی قاعدہ کے موافق ''کانّ'' کا لفظ ''الذی'' موصول کے صلہ میں واقع نہیں ہوسکتا، اس ضرورت سے حرف تشبیہ یعنی لفظ ''کانّ'' کو مقدم لانا پڑتا تھا اور وہ مقدم نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اس کے اسم وخبر صلہ کے جزو تھے، اس لیے حرف کاف جو اصل لفظ تشبیہ کا تھا وہ اس کی جگہ مقدم کیا گیا۔

قرآن مجید میں اس شخص کا جس کا رویا یہاں بیان ہوا ہے ذکر نہیں ہے اور نہ اس قریہ کا ذکر ہے جس میں گزرنا اس شخص نے رویا میں دیکھا تھا، غالباً اس قریہ کے تعین کی ضرورت بھی نہیں کیوں کہ اس شخص نے رویا میں دیکھا ہوگا کہ میں ایک قریہ میں گزرا ہوں جو ویران پڑا ہے، البتہ اس شخص کی جس نے یہ رویا دیکھا اس کی تعیین کرنی چاہیے، غالباً آنحضرتؐ کے زمانہ میں اس شخص کے نام کو ہر کوئی جانتا ہوگا مگر اب ہمارے پاس اس شخص کا نام متعین کرنے کو بجز روایات اور تاریخی واقعات کے اور کچھ نہیں ہے۔ تاریخی واقعات سے جہاں تک کہ تحقیق ہوسکتے ہیں اور جن پر اعتماد ہوسکتا ہے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت نحمیا نبی تھے۔

توریت میں جو واقعات بیت المقدس کی ویرانی کے لکھے ہیں اور جو زمانہ اس کا قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت نصر نے ۵۹۰ قبل مسیح میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور ۵۸۸ قبل مسیح میں بیت المقدس کو فتح کیا اور معبد کو جلا دیا اور بیت المقدس کو ویران کر دیا مگر کیخسرو بادشاہ ایران نے غلبہ پاکر یہودیوں کو قید بابل سے آزاد کیا اور ۵۴۶ قبل مسیح کے انہوں نے بیت المقدس میں واپس آکر قربانیاں کیں، اس کے بعد کسی بادشاہ نے یہودیوں کو بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دی اور کسی نے پھر منع کر دیا، پھر ۵۱۸ قبل مسیح میں دارا نے بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دے دی مگر ہامان کی دشمنی سے حرج پڑتا رہا۔

۴۶۷ قبل مسیح کے عزیر پیغمبر بیت المقدس میں گئے اور یہودیوں کی بھلائی کا زمانہ شروع ہوا مگر بیت المقدس اسی طرح جلا ہوا اور ڈھیا ہوا پڑا تھا۔ حضرت نحمیا نبی کو اس کا بہت رنج تھا، انہوں نے خدا سے بہت التجا اور دعا کی کہ وہ کسی طرح پھر تعمیر ہو، ایک دفعہ ارتحشستائی بادشاہ کے حضور میں حاضر تھے، بادشاہ نے پوچھا کہ تم کیوں رنجیدہ ہو، انہوں نے کہا کہ میں کیوں رنجیدہ نہ ہوں کہ وہ شہر جس میں ہمارے بزرگوں کے مزار ہیں ویران پڑا ہے اور اس کے دروازے آگ سے جلے پڑے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا کہ پھر تو کیا چاہتا ہے، حضرت نحمیا نے کہا کہ آپ مجھ کو وہاں جانے دیں تا کہ میں اس کو پھر تعمیر کروں، بادشاہ نے اجازت دی اور ایک میعاد مقرر کی کہ اس عرصہ میں تعمیر کر کے واپس آ جانا۔

حضرت نحمیا بیت المقدس کی تعمیر میں مصروف تھے تو لوگ ان پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ کیا وہ بیت المقدس کو بنا لیں گے اور اس کے پتھروں کو جو جلے ہوئے اور خاک کے ڈھیروں کے تلے جمع ہیں نکال لیں گے، کتاب نحمیا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نحمیا کو بیت المقدس کی تعمیر کی بڑی فکر تھی اور خدا کے سامنے ہمیشہ التجا اور دعا کیا کرتے تھے، بلا شبہ ان کے دل میں یہ بات گزری ہوگی کہ اس شہر کے مرجانے یعنی ویران ہوجانے کے بعد کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو زندہ یعنی آباد کرے گا۔ انہیں تردداتِ اور خدا سے التجا کرنے کے زمانہ میں جیسا کہ مقتضائے فطرتِ انسانی ہے، حضرت نحمیا نے رویا میں دیکھا اور ان کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس آباد اور تعمیر ہو جائے گا، اسی رویا کا ذکر اس آیت میں ہے اور وہ رویا یہ ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ میں ایک قریہ میں گیا ہوں جو بالکل ڈھے گیا ہے اور ویران پڑا ہے۔ رویا ہی میں انہوں نے کہا کہ اس قریہ کے اس طرح مرجانے یعنی ویران ہوجانے کے بعد کس طرح خدا اس کو زندہ یعنی آباد کرے گا، اسی حالت میں انہوں نے دیکھا کہ میں مر گیا ہوں اور پھر جی اٹھا ہوں، رویا میں ان سے کسی نے کہا کہ کتنی دیر تک تم پڑے رہے، انہوں نے کہا کہ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم، اس نے کہا کہ تم سو برس تک پڑے رہے، اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ تو نہیں بگڑیں اور اپنے گدھے کو دیکھ کہ اس کا حال کیا ہوگیا ہے اور دیکھ کہ پھر اس کی ہڈیاں کس طرح ہلتی ہیں اور کس طرح ان کے اوپر گوشت چڑھتا ہے، اس عجیب رویا سے ان کو تسلیم ہوئی کہ بیت المقدس ضرور تعمیر ہو جاوے گا۔ پس یہی قصہ جو خدا کی قدرت اور حکمت اور عظمت کو جتاتا ہے، اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

ہمارے مفسروں کی عادت ہے کہ سیدھی بات کو بھی ایک عجوبہ بنا کر بیان کرتے ہیں اور سنی سنائی باتیں ناتحقیق اور قصے اور کہانیاں اس میں شامل کر دیتے ہیں۔ اس طرح اس میں بھی کیا ہے، بایں ہمہ جب ان تمام باتوں پر غور کیا جاتا ہے تو جو اصل بات ہے وہ بھی اس میں نکل سکتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر بھی جو روایت ابن عباس کے نام سے تفسیر کبیر میں بیان کی ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ یہ تمام واقعہ جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک رویا تھا، اس روایت میں بجائے حضرت نحمیا کے حضرت عزیر کا نام لکھا ہے، ممکن ہے کہ وہ خواب دیکھنے والے حضرت عزیر ہی ہوں مگر تاریخ سے مطابقت کرنے سے حضرت نحمیا کا ہونا زیادہ ترقرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اسی روایت میں لکھا ہے کہ جب وہ بیت المقدس پہنچے تو وہاں انجیر اور انگور پھل رہے تھے، انہوں نے انجیر اور انگور کھائے اور انگوروں کو نچوڑ کر ان کا شیرہ پیا اور سو رہے اور سونے ہی کی حالت میں خدا تعالیٰ نے ان کو مردہ کر دیا اور سو برس تک مرے پڑے رہے۔ ان لفظوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علمائے متقدمین کی بھی یہ رائے تھی کہ یہ واقعہ حالت نوم میں گزرا تھا جس کو ہم نے سیدھی طرح رویا سے تعبیر کیا ہے باقی قصہ جو اس روایت میں لکھا ہے محض بے اصل ہے جس کے لیے کوئی سند نہیں ہے۔(۲۵)

سورۂ بقرہ کی طرح دوسری سورتوں کی تفسیر میں بھی اعلیٰ پایہ کی متعدد تاریخی اور مذہبی تحقیقات موجود ہیں جن سے دوسری تفسیروں کے صفحات خالی ہیں لیکن بعض تاریخی واقعات کی تحقیق میں سرسید نے غلطیاں بھی کی ہیں، مثلاً سورۂ کہف کی تفسیر میں جو بہت مفصل ہے، ذوالقرنین اور تعمیر سد کے متعلق ان کی تحقیق صحیح نہیں ہے۔(۲۶)

سرسید نے اپنی تفسیر میں تاریخی وجغرافیائی تحقیقات کے علاوہ اسلامی مسائل اور معتقدات کی تشریح وتوضیح بھی نہایت عمدگی سے کی ہے اور معاندین اسلام کے اعتراضات کو جس طرح علمی اسلوب میں قوی عقلی اور تاریخی دلائل سے رد کیا ہے وہ بصیرت افروز ہے، اس سلسلے میں بالخصوص جہاد کی بحث بڑی معرکہ آرا ہے۔(۲۷) معراج النبیؐ کا واقعہ اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، مغرب کے اہل علم معترض ہیں کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اسلام کے پیغمبرؐ اپنے مادی جسم کے ساتھ براق نامی جانور پر سوار ہو کر شب میں بیت المقدس (فلسطین) گئے اور وہاں سے آسمان پر تشریف لے گئے اور پھر اسی شب میں مکہ واپس آ گئے۔

سرسید نے شرح و بسط کے ساتھ اس واقعے کا نقلی اور عقلی دونوں طرح جائزہ لیا ہے اور اس سلسلے میں وارد جملہ احادیث اور علماء و مفسرین کے اقوال پر تنقیدی نظر ڈالی ہے، یہ علمی بحث ۱۴۵ر صفحات پر محیط ہے اور اس موضوع پر حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔انھوں نے ناقابل تردید دلائل سے ثابت کیا ہے کہ معراج کا واقعہ رویا میں پیش آیا تھا نہ کہ حالت بیداری میں، جیسا کہ بہت سے علما و محدثین کا خیال ہے۔ملحوظ رہے کہ ایک نبی کا رویا عینی مشاہدہ سے کہیں زیادہ حقیقی اور قابل اعتبار ہوتا ہے۔

پانچویں خصوصیت : ''تفسیر القرآن'' کی پانچویں قابل ذکر خصوصیت کا تعلق قرآن مجید کے اسلوب بیان اور اس کی منفرد لفظیات سے ہے۔سرسید پہلے ہندوستانی عالم و مفسر ہیں جنھوں نے وضاحت سے یہ بات بتائی کہ قرآن مجید گو خدا کا کلام ہے لیکن وہ ایک انسانی زبان یعنی عربی زبان میں نازل کیا گیا تھا اس لیے الفاظ قران کے وہی معنی لیے جائیں گے جو قدیم اہل عرب کے محاورہ میں سمجھے جاتے تھے۔اس حقیقت کے انکشاف نے قرآن مجید کی متعدد سورتوں کی تفہیم کو آسان بنا دیا ہے اور اب ان تاویلات کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی جو تفسیروں میں قرآن کی مشکل آیات اور اس کے الفاظ و مصطلحات کی تشریح میں اختیار کی گئی ہیں۔سرسید لکھتے ہیں:

> ''باوجود اس بات کے تسلیم کرنے کے کہ قرآن مجید بلفظہٖ خدا کا کلام ہے مگر جب کہ وہ عربی میں اور انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے تو اس کے معنی اسی طرح پر لگائے جاتے ہیں اور جس طرح کہ انسان استعارہ و مجاز و کنایہ و تشبیہ و تمثیل اور دلائل لمی و اقناعی و خطابی و استقرائی و الزامی کو کام میں لاتا ہے اسی طرح قرآن مجید میں بھی استعارہ و مجاز و کنایہ و تشبیہ و تمثیل اور دلائل لمی و اقناعی وخطابی و استقرائی و الزامی سب موجود ہیں''۔(۲۸)

اسی سلسلۂ بحث میں سرسید نے ایک اور اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے، ایک مقصود بالذات اور دوسرا توضیحی۔انھوں نے اس طرح کے کلام کے لیے کلام مقصود اور کلام غیر مقصود کی اصطلاح استعمال کی ہے۔اس نوعیت کلام کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''قرآن مجید کے معنی قرار دینے میں ہم کو ایک اور امر کا تصفیہ بھی لازم ہے کہ جس کلام پر ہم استدلال کرتے ہیں آیا وہ کلام مقصود ہے یا غیر مقصود، کیوں کہ اگر وہ

کلام غیر مقصود ہے تو اس سے استدلال نہیں ہوسکتا ہے............مثلاً خدا کا یہ فرمانا کہ ''اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ'' (اعراف:۴۰) اس سے یہ استدلال نہیں ہوسکتا کہ کسی وقت میں اونٹ سوئی کے ناکہ سے نکل جائے گا کیونکہ وہ کلام غیر مقصود ہے اور صرف ان لوگوں کے لیے جنہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا ہے جنت میں داخل ہونے کے عدم امکان کا بیان ہے۔اسی طرح اس آیت سے آسمان کے دروازوں کے ہونے پر بھی استدلال نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہ کلام اس مقصد کے لیے نہیں بولا گیا ہے بلکہ صرف خدا کی رحمت سے محروم رہنے کے مقصد سے بولا گیا ہے۔اسی طرح کلام غیر مقصود کی بہت سی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور ان سے اس کے اصلی معنوں پر استدلال نہیں ہوسکتا''۔(۲۹)

بہت سے مفسرین قرآن مجید کی متعدد آیات کی تفہیم سے محض اس لیے قاصر رہے کہ انہوں نے ان کے تمثیلی اسلوب کو غیر تمثیلی سمجھ لیا۔اس کی ایک مثال سورۂ بقرہ کی آیات ۳۰ تا ۳۸ ہیں۔ان آیات میں دو واقعے بیان کیے گئے ہیں، ایک اللہ اور اس کے فرشتوں کے درمیان تخلیق آدم کے متعلق مکالمہ اور دوسرا ابلیس کا آدم کو بہکانا اور اس کے نتیجے میں ان کا جنت سے اخراج۔زیادہ تر متقدمین مفسرین نے ان واقعات کو واقعی قصہ قرار دیا ہے یعنی جن الفاظ میں یہ قصے بیان کیے گئے ہیں ٹھیک ان کے مطابق خارج میں واقع ہوئے تھے۔ہندوستانی مفسرین کا بھی یہی خیال ہے۔جناب ابوالکلام آزاد نے اس واقعے سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ ''یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا بلکہ استفہام تھا''۔(۳۰) ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کو فی الواقع ایک قصہ خیال کرتے تھے، جناب امین احسن اصلاحی بھی اس کی واقعیت پر یقین رکھتے تھے، گو وہ عالم غیب میں پیش آیا تھا، انہوں نے لکھا ہے: ''یہاں ....آدم، ملائکہ اور ابلیس کے متعلق ایک ایسے ماجرے کا حوالہ دیا گیا ہے جو عالم غیب میں پیش آیا ہے اور جس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے''۔(۳۱)

ان مفسرین کے برخلاف سرسید نے اس کو ایک تمثیلی واقعہ قرار دیا ہے جس کے ذریعے تخلیق آدم کے اسرار سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور اس مقصد کے لیے تمثیلی اسلوب ہی موزوں تھا۔سرسید نے

اس قصے پر بالتفصیل بحث کی ہے۔ہم اس طویل بحث کا جس میں فرشتوں کا شخصی وجود بھی زیر بحث آیا ہے،صرف وہ حصہ نقل کرتے ہیں جس کا تعلق اصل واقعے سے ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس آیت (واذقال ربك) سے وہ ذکر شروع ہوا ہے جو آدم کا قصہ کہلاتا ہے،تمام مفسرین اس کو ایک واقعی جھگڑا یا مباحثہ سمجھتے ہیں جو خدا اور فرشتوں میں ہوا، تعالی شانہ عما یقولون......اگر فرض کریں کہ فرشتے اور شیطان ایک علاحدہ وجود رکھتے ہیں کہ عموماً مسلمانوں کا عقیدہ ہے تو بھی یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا فی الواقع یہ مباحثہ خدا اور فرشتوں میں ہوا تھا؟ کیوں کہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے خدا سے مباحثہ نہیں کر سکتے ہیں بلکہ اس کے حکم کو بجالاتے ہیں۔خدا نے فرمایا ہے:

''وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ'' (سورۂ انبیاء:۲۶، ۲۷) یعنی کافروں نے کہا کہ خدا نے بیٹا بیٹی بنائے ہیں، حالانکہ وہ اس سے پاک ہے بلکہ (جن کو وہ بیٹا بیٹی کہتے ہیں وہ) معزز بندے (یعنی عمدہ مخلوق) ہیں، خدا کے آگے بڑھ کر بات نہیں کرتے اور جو وہ کہتا ہے وہی وہ کرتے ہیں۔اس آیت سے فرشتوں کو مجال مباحثہ خدا سے نہیں معلوم ہوتی، پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ فی الواقع فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا ٹنٹا کیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ ان آیتوں میں خدا تعالیٰ انسان کی فطرت کو اور اس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جو قوائے بہیمیہ اس میں ہیں ان کی برائی یا ان کی دشمنی سے اس کو آگاہ کرتا ہے مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں کے اور اونٹ چرانے والوں کے فہم سے بہت دور تھا، اس لیے خدا نے انسانی فطرت کو بیان کیا ہے تا کہ ہر کوئی خواہ اس کو فطرت کا راز سمجھے،خواہ فرشتوں اور خدا کا مباحثہ،خواہ شیطان و خدا کا جھگڑا،اصلی مقصد حاصل کرنے سے محروم نہ رہے،اس طرح پر عام وخاص، سمجھدار اور ناسمجھ، عالم و جاہل کا یکساں قرآن مجید سے مقصد پانا درحقیقت بہت بڑا معجزہ قرآن کا ہے۔توریت میں لکھا ہے کہ ''خدا نے فرشتوں سے کہا کہ آؤ ہم آدمی کو اپنی صورت پر بنادیں''، یہ مضمون مسلمان مفسروں کے دل میں تھا اور وہ اس کو مثل یہودیوں کے ایسا ہی سمجھ رہے تھے جیسے کہ ایک آدمی سے ایک آدمی بات کرتا ہے ''اذقال ربك للملائكة'' کو بھی انہوں نے ویسا ہی سمجھا اور آدم وشیطان کا قصہ بنالیا ورنہ صرف انسان کی فطرت کا زبان حال سے بیان کیا ہے۔

اس طرح مخلوق کی زبان حال سے سوال وجواب میں مطالب کا بیان اور جگہ بھی قرآن مجید

میں آیا ہے، خدا نے زمین کی زبان حال سے حکایۃً فرمایا کہ ”جب ہم نے آسمان و زمین سے کہا کہ تم دونوں خواہ نخواہ حاضر ہو، دونوں نے کہا کہ ہم دونوں بخوشی حاضر ہیں“، (حٰم سجدہ:۱۱) اور جہنم کی نسبت فرمایا کہ ”جس دن ہم جہنم کو کہیں گے کہ تو بھر گئی؟ تو وہ کہے گی کہ ہے اس سے زیادہ اور بھی؟“ (سورۂ ق:۳۰) پس ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے ایسی چیزوں کی زبان حال سے جو گویا نہیں ہیں، سوال جواب کے طور پر ان کی فطرت کو جس طرح کہ انسان کے خیال میں آسکتی ہے بیان کیا ہے“۔(۳۲)

آدم و ابلیس کا قصہ قرآن مجید میں مجملاً بیان ہوا ہے لیکن تورات میں اس کا ذکر تفصیل سے ہے اور اسی قصے کو معمولی کمی و بیشی کے ساتھ ہمارے مفسرین نے اپنی تفسیروں میں داخل کر دیا ہے اور اس کو اس طرح بیان کیا ہے جیسے فی الواقع کسی مخصوص مقام پر کوئی باغ تھا جس میں آدم و حوا آرام وسکون سے زندگی بسر کر رہے تھے، ابلیس نے بر بنائے حسد ان کو بہکایا اور وہ شجر ممنوع کا پھل کھا کر اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے اور بالآخر جنت سے نکال کر دنیا میں بھیج دیے گئے لیکن درحقیقت یہ قصہ بھی تمثیلی نوعیت کا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

”تین لفظ اس قصہ میں اور ہیں ”جنت، شجر، ہبوط“ علمائے اسلام نے اس کے بیان میں عجب باتیں کی ہیں، جو لوگ کہ صرف لفظوں ہی پر چلتے ہیں، انہوں نے تو جنت کو ایک خیالی بہشت عالم بالا پر مان لیا اور درخت سے بھی سچ مچ کا کوئی درخت (گیہوں کا یا انگور کا یا انجیر کا) اور ”ہبوط“ سے عالم بالا سے زمین پر گرنا۔

توریت میں بھی یہ قصہ نہایت عمدگی و لطافت سے بیان کیا گیا ہے، اس میں جنت سے ایک باغ کا دنیا میں آدم کے لیے لگانا اور اس میں دو درختوں کا ہونا جن کے کھانے سے آدم کو منع کیا تھا، ایک درخت، علم خیر و شر اور دوسرا درخت حیات بیان ہوا ہے۔ یہودی اور عیسائیوں نے بھی توریت کے بیان لطیف کو نہایت ابتر و خراب طرح پر بیان کیا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ درحقیقت خدا نے عدن میں ایک باغ اگایا تھا اور اس میں سچ مچ کے دو درخت تھے، ایک کی یہ تاثیر تھی کہ اس کے کھانے سے علم خیر وشر آجاتا ہے، جیسے سقمونیا کے کھانے سے دست آجاتے ہیں اور دوسرے کا پھل امرت کا پھل ہے جس کے کھانے سے آدمی کبھی نہیں مرتا۔ پس بہت سے علمائے اسلام نے جن کو اس قسم کے قصص میں یہودیوں کی پیروی کرنے کی عادت پڑ گئی ہے، ان کی پیروی کی، انہوں نے کہا کہ یہ جنت زمین پر تھی

اور ''ہبوط'' سے انہوں نے جنت سے باہر نکال دینے کے معنی لیے (تفسیر کبیر)، معتزلہ نے اس کی جگہ بھی بتادی تھی کہ فلسطین میں یا فارس و کرمان کے بیچ میں تھی (تفسیر بیضاوی) اور بعضوں نے کہا کہ سدرۃ المنتہیٰ بھی زمین ہی پر تھا۔

مگر ہم ان معنوں میں سے کسی کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم شروع ہی سے اس قصہ کو ایک واقعی قصہ نہیں سمجھتے بلکہ صرف انسانی فطرت کا اس کی زبان حال سے بیان قرار دیتے ہیں، پس انسان کا جنت میں رہنا اس کی فطرت کی ایک حالت کا بیان ہے جب تک کہ وہ مکلف کسی امر و نہی کا نہ تھا......اور اس کا شجر ممنوعہ کے پاس جانا، اس کا پھل کھانا، اس کی فطرت کی اس حالت کا بیان ہے جب کہ وہ اوامر و نواہی کا مکلف ہوا اور ''ہبوط'' سے اس کی فطرت کی اس حالت کا تبدیل ہونا مراد ہے، جبکہ وہ غیر مکلف سے مکلف ہوا، ''ہبوط'' کے لفظ کا استعمال صرف انتقال مکان ہی پر مختص نہیں ہے (قاموس)''۔ (۳۴)

چھٹی خصوصیت: اس تفسیر کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تقلید کی روش چھوڑ کر جس میں اکثر متقدمین اور متاخرین علماء تفسیر مبتلا نظر آتے ہیں، اجتہاد کی راہ اختیار کی گئی ہے لیکن یہ اجتہاد فکری بے راہ روی نہیں ہے بلکہ متعین نقلی اور عقلی اصولوں کی پابندی کے ساتھ ہے، گو کہیں کہیں اس سے انحراف بھی ملتا ہے۔

سرسید نے تقلید کے بجائے اجتہاد کا راستہ اس لیے منتخب کیا کہ ''تفسیر القرآن'' کی تصنیف سے ان کا مقصد جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے، جدید علم کلام کی تشکیل تھا یعنی اسلام کے اہم مسائل اور معتقدات کی ایسی عقلی تشریح کرنا جس سے جدید دور کے اصحاب علم کی تشفی ہو اور اگر ان کے قلوب و اذہان میں امور کے بارے میں کوئی شک ہو تو دور ہو جائے اور معاندین اسلام کے اعتراضات رفع ہو جائیں۔ میں پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ سرسید کی تفسیر اس کلامی ضرورت کو احسن طریقے سے پورا کرتی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس تفسیر میں کوئی عیب نہیں ہے، کس تفسیر میں عیب نہیں ملے گا۔ ہم مانتے ہیں کہ معتقدات سے متعلق بعض فروعی مسائل کی توضیح میں سرسید سے لغزشیں سرزد ہوئی ہیں، (۳۵) لیکن چند تسامحات کی وجہ سے تفسیر کے محاسن سے جن کی مقدار بہت زیادہ ہے، چشم پوشی کرنا نادانی کی بات ہوگی۔ تسلیم کرنا ہوگا کہ سرسید نے یہ تفسیر لکھ کر مطالعہ قرآن کی ایک ایسی راہ کھولی ہے جو

پچھلی راہوں سے مختلف مگر کشادہ اور روشن ہے۔ مابعد کے کئی ہندوستانی مفسرین کی تفسیروں میں ابتکار فکر کے جو نمونے ملتے ہیں وہ سرسید ہی کا بالواسطہ فیضان ہے۔ اس تفسیر پر حالی کا درج ذیل تبصرہ سچائی پر مبنی ہے:

"اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں .... بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور ہمدردی کے علاوہ ان کی لٹریری لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر کرتا ہے"۔ (۳۵)

حوالے و حواشی

(۲۱) تفسیر القرآن، ج ا، ص ۲۷۱۔ (۲۲) ایضاً، ج ا، ص ۲۱۸۔ (۲۳) ایضاً، ج ا، ص ۲۱۸-۲۷۔ (۲۴) تدبر قرآن، ج ا، ص ۷۰۱۔ (۲۵) تفسیر القرآن، (سورہ بقرہ)، ج ا، ص ۲۲۷-۲۳۴۔ (۲۶) سرسید نے بادشاہ چین چی، وانگ، ٹی کو جو ۲۴۷ قبل مسیح میں تخت پر بیٹھا، ذوالقرنین اور بانی سد قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اسی بادشاہ نے دوسو چالیس قبل مسیح اس دیوار کو تعمیر کیا تھا اور یہ وہی طویل دیوار ہے جو دیوار چین (گریٹ وال) کے نام سے مشہور ہے (تفسیر القرآن، حصہ دوم، سورۂ کہف، ص ۸۸-۹۰)۔ اس تحقیق کی تائید قرآن مجید کے الفاظ سے ہوتی ہے اور نہ ہی تاریخ چین سے۔ سورۂ کہف کی کئی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ایک موحد بادشاہ تھا۔

اس سلسلے میں امام رازی کی تحقیق بھی غلط ہے، انہوں نے ذوالقرنین سے مقدونیہ کا سکندر اعظم مراد لیا ہے۔ اس سے بھی عجیب تر خیال مشہور مورخ ابوریحان البیرونی کا ہے۔ اس نے اپنی کتاب "آثار الباقیة عن قرون الخالیة" میں حمیری خاندان کے بادشاہ ابوکرب شمس بن عبیر بن افریقس کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ (دیکھیں تفسیر القرآن، حصہ دوم، سورۂ کہف: ص ۸۰-۸۳)

اب اثری تحقیقات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ذوالقرنین سے مراد چھٹی صدی قبل مسیح کا ایرانی بادشاہ سائرس (Cyrus) یعنی کیخسرو ہے، اسی بادشاہ کا لقب ذوالقرنین تھا (تفصیل کے لیے دیکھیں راقم کی تفسیر، میزان القرآن، ج ۲، ص ۵۳۱-۵۳۶)۔

(۲۷) حیات جاوید، ص ۴۹۴-۵۰۸۔ (۲۸) تفسیر القرآن، ج ا، تحریر فی اصول التفسیر، ص ۱۴۔ (۲۹) ایضاً،

ص ۱۶۔(۳۰)تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۶۲، حاشیہ ۳۹۔(۳۱) تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۵۶۔(۳۲)تفسیر القرآن (سورہ بقرہ)، ج ۱، ص ۳۹-۴۶۔(۳۳) ایضاً، ج ۱، ص ۵۰، ۵۱۔(۳۴) سرسید فرشتوں کے شخصی وجود کو نہیں مانتے تھے، وہ انہیں فطرت کے قویٰ قرار دیتے تھے، جنوں کے وجود کے سرے سے منکر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں اس کا ذکر آیا ہے اس سے انسان کے قوائے بہیمیہ کی طرف اشارہ ہے۔ سرسید کے بات میں وزن ہے اور متعدد قرآنی آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ معجزات کے اس معنی میں منکر تھے کہ وہ خارق عادت ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی بھی معجزہ سبب سے عاری نہیں ہوتا گو وہ ظاہر نہ ہو۔ کئی جید علما جن میں شاہ ولی اللہ محدث بھی شامل ہیں، یہی خیال رکھتے تھے (دیکھیں شاہ صاحب کی کتاب ''التفہیمات الالٰہیہ'')۔ قرآن مجید میں بعض ایسے واقعات کا ذکر ہوا ہے جو بظاہر مافوق فطرت (Super Natural) ہیں، مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا ہونا، پالنے میں ایک آدمی کا کلام کرنا اور مردے کو زندہ کر دینا وغیرہ۔ سرسید نے ان واقعات کی تاویل کی ہے لیکن یہ سراسر تاویل بے جا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ انہوں نے اسلام کے بنیادی عقائد (توحید، رسالت، آخرت) کی جو تشریح کی ہے وہ بالکل صحیح اور نصوصِ قرآنی کے مطابق ہے، اس لیے دین کے فروعی امور میں بعض فکری لغزشوں کی وجہ سے ان کی تضلیل و تکفیر کرنا بدترین ناانصافی ہے۔ (۳۵) حیات جاوید، ص ۲۲۲، مزید دیکھیں: ص ۵۱۲-۶۲۴۔

تذکرۂ محدثین جنوب

(نویں صدی سے چودھویں صدی ہجری تک)

ڈاکٹر راہیؔ فدائی

(۲)

چودہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں جن محدثین نے تحریر وتدریس کے ذریعہ علومِ حدیث کی بے بہا خدمات انجام دیں، ان میں فخر المحدثین علامہ صبغۃ اللہ معروف بہ قاضی بدرالدولہ مدراسی (متوفی ۱۲۸۰ھ) کے گیارہ فرزندوں میں سے نامور محدث مولانا مفتی محمد سعید مدراسی حیدرآبادی (متوفی ۱۳۱۲ھ) کا ذکر خیر تیرہویں صدی ہجری کے تحت کیا گیا ہے۔ اب یہاں قاضی بدرالدولہ کے ان صاحبزادوں کا تذکرہ مقصود ہے، جنہوں نے مدرسۂ محمدی (قائم شدہ ۱۳۰۹ھ) میں منصب تدریس کو زینت بخشی اور تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی ممتاز رہے۔ ان میں سے ایک مولانا مفتی محدث محمود (۱۲۶۹ھ تا ۱۳۴۵ھ) مدراس کے باکمال اساتذۂ کرام سے استفادہ کے بعد حجاز اور مصر میں علما سے فیض حاصل کیا، علاوہ ازیں مکہ مکرمہ میں شیخ محمد شربینی سے علم قرأت میں بتاریخ ۱۳؍صفر ۱۳۰۸ھ سند تسلسل حاصل کی۔ بتاریخ ۱۴؍جمادی الاول ۱۳۰۹ھ تونس کے شیخ محمد بن احمد مکی نے سند اتصال سے نوازا، اس سے پیشتر سلطنت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان عبدالحمید نے ان کی غیر معمولی علمی خدمات کے پیش نظر ان کو ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں ترکی کے اعلیٰ ایوارڈ ''تمغۂ مجیدی'' سے سرفراز فرمایا تھا۔ موصوف کی عربی میں ۱۷، فارسی میں ۶؍ اور اردو میں ۸ کتابیں یادگار چھوڑیں، اور تین ضخیم جلدوں میں ''فتاوائے محمودیہ'' کے نام سے ان کے فتاویٰ بھی جمع کئے گئے ہیں۔ عربی تصنیفات میں ''اسماء الرجال'' اور ''حاشیہ نخبۃ الفکر علیٰ مصطلح اھل الاثر'' مشہور ہوئیں۔ اول الذکر کا سال تصنیف معلوم نہ ہوسکا، دوسری کتاب جو ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے یہ بتاریخ یکم رجب ۱۳۱۶ھ بروز چہارشنبہ

پتہ: ۲۸، گراؤنڈ فلور، 2nd، بی۔کراس، 4th بلاک، H.B.R لے آؤٹ، بنگلور، کرناٹک۔

پایۂ تکمیل کو پہنچی۔(۴۵)

قاضی بدرالدولہ کے دوسرے صاحبزادے شمس العلماء قاضی عبیداللہ (۱۲۷۱ھ تا ۱۳۴۶ھ) بھی علوم منقولات کے ماہر اور مدرسہ محمدی کے بلند پایہ استاذ تھے، حکومت وقت نے ۱۲۹۷ھ میں ریاست مدراس کا قاضی نامزد کیا تھا، وہ اہل قلم تھے، عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں بائیس[۲۲] سے زائد کتابیں لکھیں، ان میں: ۱۔ ''الروضة المكلله فی الاحادیث المسلسلة'' ۲۔ ''الصلوٰۃ الطیبات علیٰ خیر البریات'' اور ''چہل حدیث'' بھی ہیں۔(۴۶)

قاضی بدرالدولہ کے ایک اور فرزند مولانا محمد عبداللہ مدارت خاں بہادر (۱۲۳۶ھ تا ۱۲۸۸ھ) بھی صاحب علم وعرفان تھے۔ نواب غلام غوث خاں بہادر (متوفی ۱۲۷۲ھ) کے دور اقتدار میں صدرالصدور کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ کتابوں سے عشق تھا، ذاتی کتب خانے میں ہزاروں قیمتی کتابیں تھیں، اپنے بزرگوں کی طرح تصنیف وتالیف سے شغل رکھتے تھے، ان کی ''فیض الباری فی تخریج احادیث البیضاوی'' مخطوطے کی صورت میں کتب خانہ مدرسہ محمدی میں موجود ہے۔(۴۷)

چودہویں صدی ہجری کے تذکرۂ محدثین کا اختتام ایک ایسی عظیم الشان شخصیت پر ہوگا جنھوں نے نصف صدی سے زائد مدت حدیث شریف کے تعلیم وتعلم میں گزارا اور اسناد کے فن کو چودھویں صدی ہجری میں زندہ کردیا۔ بقول مولانا ابوالکلام آزادؔ (متوفی ۱۹۵۸ء):

> ''افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں علوم اسلامیہ کے درس وتدریس کے تنزل سے حفظِ اسناد وسلاسل کا ذوق بھی ناپید ہو رہا ہے اور اسماً ورسماً بھی اخذ سند واجازت کی بہت کم پروا کی جاتی ہے، ان حالات میں مولوی صاحب موصوف کا یہ اہتمام یقیناً نہایت درجہ مغتنم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی مشکور فرمائے اور اس رسالہ کا مطالعہ طالب علم کے لیے موجب برکت وبصیرت ہو۔''(۴۸)

موصوف کا اسم گرامی ابوالسعید محمد عبدالہادی مسکینؔ ہے۔ مدراسی ثم حیدرآبادی ہوئے۔ وطن مالوف قصبہ ''پلی کُنڈا'' (ضلع ویلور، ٹمل ناڈو، (Pallikunda, Dist. Vellore, T.N.) ہے۔ (۴۹) ولادت ۱۲۸۲ھ کی ہے۔ تعلیم وتربیت کے ابتدائی مراحل والد ماجد مولانا الحاج محمد عبدالکریم حنفی ابن مولانا شیخ احمد بن حسین واعظ وخطیب، پلی کنڈہ کی رہنمائی میں طے کیے۔ پھر فارسی ادبیات کے

باکمال استاذ ''مولانا عبدالرحمٰن'' کے شاگرد باکمال ہونے کی راہ پر گامزن ہوئے۔

بعد میں شہر ''وانمباڑی'' کے مدرسہ ''مفید عام'' (قائم شدہ ۱۲۸۹ھ) میں داخل ہوئے جہاں مولانا شیخ ابوالحسن محمد عبیدالسبحان بن علامہ حافظ شیخ محمد سے ابتدائی عربی صرف ونحو اور مولانا شاہ عبدالمجید پنگنوری (متوفی ۱۳۵۶ھ) خلیفہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ) سے نحو کی مطولات اور ''تفسیر جلالین'' پڑھیں، بچپن ہی میں حفظ قرآن کریم سے فارغ ہو چکے تھے۔ عربی درسیات کی تعلیم کے دوران فن قرأت وتجوید میں مولانا قاری عبدالرحیم سے اس فن میں دسترس حاصل کی۔

اس وقت مدرسہ ''مفید عام'' میں طب کی تعلیم نہیں تھی، اس لیے مولانا عبدالہادی نے شہر کی دوسری درسگاہ ''مدرسۂ اعظم'' کا رخ کیا اور مشہور طبیب مولانا شاہ عبدالرزاق صوفی سے فن طب کی تعلیم حاصل کی۔ (۵۰) ان کا نکاح غالباً ۱۳۰۳ھ میں ہوا۔ (۵۱) جن سے بیٹے عبدالمجیب اور عبدالرقیب پیدا ہوئے۔ (۵۲) یہ بھی بعد میں علوم حدیث کے ماہر ہوئے۔

وانمباڑی کی ایک دینی درسگاہ ''مدرسہ معدن العلوم'' کے اولین جلسۂ دستار بندی کے موقع پر سند فراغت بھی حاصل کرلی۔ (۵۳) ''معدن العلوم'' میں جن اساتذہ کرام سے شرف تلمذ حاصل رہا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

۱۔ علامہ جامع معقول ومنقول محدث شہیر محمد عبداللہ پشاوریؒ جن سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد و دیگر کتب معقول ومنقول پڑھیں۔

۲۔ فقیہ عصر علامہ زماں شان پشاوریؒ جن سے ہدایہ اور بعض کتب معقولات کی تعلیم حاصل کی۔

۳۔ علامہ ادیب وفقیہ مولانا سید شرف الدین جن کی خدمت میں حاضر ہوکر فن معانی، بیان وبدیع، کتب فقہ وفرائض، فن ہیئت وحکمت اور حساب سیکھا۔

علاوہ ازیں انھوں نے مولانا صالح محمد غوث مدراسی سے علم قوافی اور فن شعر وسخن کے حقائق و رموز اور علم عروض حاصل کیا۔ (۵۴)

مولانا عبدالہادی علیہ الرحمہ کی مکمل تعلیم وتربیت شہر ''وانمباڑی'' میں ہوئی جوان کے وطن ''پلی کنڈہ'' سے تقریباً پینتالیس (۴۵) کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جبکہ شہر ویلور جہاں ہندوستان کا اولین جمہوری مدرسہ ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) اور تین

سوسالہ عظیم خانقاہی درسگاہ ''دارالعلوم لطیفیہ'' (قائم شدہ ۱۱۳۸ھ مطابق ۱۷۲۵ء) موجود تھے، وہاں سے پلی کنڈہ کا فاصلہ صرف بیس کلومیٹر ہے، ایسی صورت میں یہ سوال ذہن کے پردے پر ابھرنا لازمی ہے کہ مولانا عبدالہادی کے والد مولانا عبدالکریم نے اپنے فرزند کی تعلیم کے لیے ویلورؔ کے بجائے وانمباڑی کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کا جواب راقم الحروف کی رائے میں یہ ہوسکتا ہے کہ مولانا عبدالہادی کی ننھیال وانمباڑیؔ ہو، جہاں رہ کر وہ اپنی تعلیمی مصروفیات جاری رکھے ہوئے ہوں، یا یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا عبدالکریم صاحب نے اپنے فرزند کی تعلیم وتربیت کے لیے ترک وطن کرکے وانمباڑیؔ میں سکونت اختیار کی ہو، اس طرح مولانا عبدالہادی کو شہر ہی میں رہ کر اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کا موقع مل گیا تھا اور انہیں کہیں اور جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ انھوں نے بعد میں مذکورہ دونوں تعلیم گاہوں سے برابر ربط وتعلق قائم رکھا تھا، چنانچہ مدرسۂ باقیات صالحات کے جید اساتذہ شمس العلماء علامہ شیخ عبدالجبار قادری ابن جناب شیخ احمد صاحب (متوفی ۱۳۵۳ھ) خلیفہ محدث کبیر وفقیہ العصر شاہ عبدالوہاب قادری ویلوی (متوفی ۱۳۳۷ھ)، حضرت علامہ حافظ قاری عبدالصمد علمیؔ (متوفی ۱۳۶۵ھ) خلیفہ اعلیٰ حضرت بانی باقیات صالحات اور علامہ شیخ الحدیث شاہ عبدالرحیم (متوفی ۱۳۶۶ھ) خلیفہ مولانا شاہ خلیل احمد امبیٹھوی، ناظر مدرسۂ باقیات کے تقاریظ مولانا عبدالہادی صاحب کی گرانقدر تصنیف ''ہادی المسترشدین الی ایصال المسندین'' کی ابتدا میں شامل ہونا اس کا بین ثبوت ہے۔ اسی طرح حضرت علامہ شمس العلما سید شاہ محمد رکن الدین (متوفی ۱۳۲۵ھ) سجادہ نشین خانقاہ اقطابِ ویلور اور حضرت علامہ محدث وفقیہ الحاج محمد محی الدین حسین صدرالمدرسین دارالعلوم لطیفیہ، ویلور سے اسناد حدیث کا حاصل کرنا ان بزرگوں سے عقیدت ومحبت کی دلیل ہے۔

غرض مولانا عبدالہادی نے ''معدن العلوم'' کی فراغت ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء کے بعد اپنے مشفق ومربی استاذ علامہ فقیہ الحاج محمد عبدالمجید پنگنوری قاسمی (متوفی ۱۳۵۶ھ) خلیفۂ شیخ الشیوخ مولانا رشید احمد گنگوہی کے مشورہ پر دیوبندؔ اور گنگوہ کا سفر کیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ) کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوکر خلافت واجازت سے سرفراز ہوئے۔ بقول حضرت علامہ سید شاہ صبغۃ اللہ بختیاری وفاؔ (متوفی ۱۴۱۴ھ):

''مولانا عبدالمجید خاں کے شاگردوں میں مولوی ابوسعید عبدالہادی واعظ ہیں،

جو فارغ التحصیل ہوکر مولانا پنگنوری کے ایماء پر دیو بند اور گنگوہ گئے۔ حضرت گنگوہی سے بیعت وخلافت سے فیضیاب ہوئے۔"(۵۵)

شمالی ہند سے واپسی کے بعد ۱۳۱۶ھ میں جنوب کے مایہ ناز شیخ محدث جلیل شمس العلماء شاہ غلام رسول مدراسی (متوفی ۱۳۴۵ھ) خلیفۂ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (متوفی ۱۳۱۷ھ) کی خدمت میں حاضر ہوکر طریقۂ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ میں اجازت حاصل کی اور خرقۂ خلافت زیب تن فرمایا۔ مزید برآں حضرت غلام رسولؒ سے سند مرویات بھی پائی۔(۵۶) مولانا عبدالہادی نے مذکورہ مشہور سلاسلِ طریقت کے علاوہ سلسلہ نظامیہ قدوسیہ کی خلافت حضرت درویش بن جناب محمد قاسم اودھی (۵۷) سے اور طریقۂ علویہ عیدروسیہ کی اجازت علامہ عارف باللہ حبیب حسین بن حبیب محمد حبشی سے حاصل کی۔(۵۸) علاوہ ازیں علامہ حافظ منشی شاہ عبدالعزیز ادھونوی (آندھرا پردیش) کی بیعت سے مشرف ہوکر خرقۂ فقیریہ پہنا۔(۵۹) حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ بن مولانا منشی محمد یٰسین آدھونوی سلطنت عادل شاہی کے خانوادۂ میر منشی مولانا سرمد حسین بن مولانا منشی محمد حسین کے چشم و چراغ تھے۔ شاہ صاحب نے اپنے والد مولانا منشی محمد یٰسین بن مولانا منشی سرمد کے دستِ مبارک سے خرقۂ خلافت پہنا تھا، شاہ عبدالعزیز کے رشتہ کے بھائی مولانا منشی عبدالصمد (متوفی ۱۳۵۸ھ) بن منشی شمس الدین ادھونوی، شاہ صاحب کی طرح جامع شریعت وطریقت اور صوفی ومحدث بزرگ تھے، منشی عبدالصمد کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے "صحیح بخاری" کی احادیث کا اختصار مع شرح، نو ضخیم جلدوں میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ اب بھی مطبوع نہیں ہیں۔ ان میں سے دو جلدیں مؤلف موصوف کے حقیقی پوتے رفیق محترم مولانا ڈاکٹر بشیر الحق قریشی بن مولانا منشی محمد نور قریشی بن مولانا منشی عبدالصمد کے ذاتی کتب خانے کی زینت ہیں۔

علوم شریعت وطریقت کی تکمیل کے بعد مولانا عبدالہادی کو علوم حدیث میں مہارت کی فکر دامن گیر ہوئی، انہوں نے ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں محدث جلیل حافظ حدیث شاعر بلند فکر علامہ قاری محمد عمر صدیقی البصیر الخراسانی کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث مسلسل بالاولیہ اور دیگر مرویات واوراد کی سندیں حاصل کیں۔(۶۰)، علامہ عمر صدیقی شیخ الشیوح سید محمد عاقبت شاہ کے شاگرد تھے، انہوں نے مولانا شاہ اسحاق دہلویؒ (متوفی ۱۲۶۲ھ) سے استفادہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالہادی کو اسی سال

یعنی ۱۳۱۹ھ میں حضرت مولانا سید حیدر حسینی سے سند مصافحہ مرحمت ہوئی، مولانا حیدر حسینی نے مولانا عبدالحق کانپوری سے اور انہوں نے علامہ حافظ نظام الدین سے اور انہوں نے شاہ ابوالسعید سے اور انہوں نے مولانا خالد رومی سے اور انہوں نے صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبدالرحمن جنّی رضی اللہ عنہ سے اور حضرت جنّی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ مصافحہ حاصل کیا تھا۔ اس طرح ان کی یہ سند بہت ہی عالی ہوگئی ہے جس میں کے (عبدالہادی) اور سرورکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف چھ واسطے ہیں۔ یہ اس لیے کہ حضرت عبدالرحمن جنات میں سے تھے اور ان کی عمر ایک ہزار سال سے زائد تھی۔(۶۱)

مولانا عبدالباری شیریں بیان واعظ اور فصیح اللسان خطیب تھے، جنوبی ہند کے واعظوں کی خوبی علاقائی زبانوں میں مہارت کی بھی تھی، ان کی طرح مولانا عبدالہادی نے بھی دعوت اسلام میں مقامی زبان کو بھی ذریعہ بنایا، ان کے اجتماعات میں بے شمار لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ۱۳۲۴ھ کے اوائل میں حیدرآباد (دکن) آئے (۶۲) تو سلطنت آصفیہ کے شعبۂ امور مذہبی (دعوت وافتاء) میں ان کو واعظ وداعی اور مفتی وقاضی کی ذمہ داری سونپی گئی (۶۳) یہاں تک کہ ان کے نام کے ساتھ لفظ ''واعظ'' بھی پہچان بن گیا۔(۶۴)

اس واعظانہ شہرت کے باوجود مولانا کو علم حدیث سے ہمیشہ اشتغال رہا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں شولاپور پہنچ کر وہاں کے برگزیدہ بزرگ محدث علامہ شیخ حکیم سید عبداللہ دہلوی اسحاق پٹنی سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ شیخ نے انہیں اپنے شیوخ سے حاصل شدہ تمام مرویات کی اجازت عطا فرمائی۔ (۶۵) شیخ عبداللہ کی ولادت ۱۲۵۶ھ میں بمقام دہلی ہوئی لیکن انہوں نے آندھرا کے ساحلی شہر ''اسحاق پٹن'' کو اپنا مستقر بنایا، یہ شہر حضرت شاہ اسحاقؒ کے نام سے آباد ہوا تھا جو وہیں ایک پہاڑی پر آسودۂ خاک ہیں۔ شیخ کی وفات پچاسی ۸۵ کی عمر میں ۱۳۴۱ھ ہوئی۔ شیخ عبداللہ کے شیوخ میں مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ) مولانا سید شاہ محی الدین عبداللطیف معروف بہ قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) مولانا شیخ حاجی امداداللہ مہاجر مکی (متوفی ۱۳۱۷ھ) مولانا شیخ رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی (متوفی ۱۳۰۸ھ) وغیرہ جیسے جبال العلم شامل ہیں۔ شیخ عبداللہ محدث اسحاق پٹنی کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے روم کے سفر میں علامہ رحمت اللہ کیرانوی کی

معیت اختیار کی تھی۔(۶۶) جبکہ سلطانِ ترکی نے علامہ کو خصوصی دعوت دے کر اپنے دربار میں ردّ عیسائیت سے متعلق ان سے مشورہ کیا تھا۔

مولانا عبدالہادی محدث نے ۱۳۲۴ھ میں اپنے دونوں فرزندوں مولانا عبدالمجیب اور مولانا عبدالرقیب کے ساتھ مکہ مکرمہ کا سفر کیا، وہاں ان سب نے حرم شریف کے محدثین سے استفادہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹؍محرم الحرام ۱۳۲۴ھ کو علامہ فقیہ، محدث و مفسر حافظ محمد عبدالحق حنفی نقشبندی مجددی مہاجر مکی (متوفی ۱۳۳۳ھ) ابن مولانا شیخ شاہ محمد بن یار محمد الٰہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوکر احادیث مسلسلات اور قرآنِ کریم کی سندیں حاصل کیں۔(۶۷) پھر دوسرے ہی دن ۲۰؍محرم ۱۳۲۴ھ شیخ العلما علامہ مفتی شیخ صالح بن علامہ صدیق کمال مرحوم حنفی مکی شاذلی، امام و خطیب و مدرس مسجد الحرام تلمیذ علامہ سید احمد بن زینی دحلان و علامہ سید علی ظاہر الوتری حنفی سے حدیث و فقہ اور تفسیر کے تمام سلاسل کی اجازت حاصل کی۔(۶۸) اسی طرح اپنے شفیق استاذ محدث کبیر حبیب حسین (ولادت ۱۲۵۸ھ وفات ۱۳۳۰ھ) ابن علامہ حبیب محمد حبشی علوی شافعی تلمیذ علامہ فاضل سید عیدروس (متوفی ۱۳۱۴ھ) ابن علامہ سید عمر بن عیدروس حبشی سے ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ میں مختلف احادیث شریفہ کی سندیں حاصل کیں۔(۶۹) مکہ مکرمہ میں ایک سال دو ماہ قیام رہا، اس مدت میں انہوں نے جن محدثین سے سندیں پائیں ان کا تفصیلی ذکر تصنیف ''ہادی المسترشدین الی ایصال المسندین'' میں کیا ہے۔ وطن حیدرآباد واپسی جہاز ''مجیدی'' کے ذریعہ بتاریخ ۵؍ربیع الاول ۱۳۲۵ھ ہوئی۔ اس جہاز میں یمن کے ایک محدث علامہ شیخ محمد بن عبدالرحمٰن حسن بن عبدالباری یمنی سفر کررہے تھے، مولانا عبدالہادی کو خبر ہوئی تو ان کی خدمت میں پہنچ کر وہیں شیخ سے کتب حدیث و تفسیر اور دیگر فنون کی اجازت حاصل کی۔ علامہ شیخ محمد کے شیوخ کبار میں مشہور محدث شیخ الاسلام محمد احمد الاھدل شامل ہیں۔(۷۰) شیخ محمد نے اپنی سند میں مولانا عبدالہادی کے نام کے آگے ''الولد الفاضل'' لکھا ہے جس سے ان کی محبت اور اپنائیت ظاہر ہوتی ہے۔ محدث شہیر علامہ شیخ محمد کی طرح علامہ شیخ احمد بن محمد بن حضراوی شافعی مکی مصنف ''عقد الثمین و بشریٰ المؤمنین فی فضائل سید المرسلین'' نے مولانا عبدالہادی محدث کو بتاریخ ۱۶؍صفر ۱۳۲۵ھ اپنی جملہ تصنیفات و مرویات کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے ''ولدنا المکرم'' کے شفقت آمیز الفاظ سے یاد کیا ہے۔(۷۱)

مولانا عبدالہادی اپنے وطن ثانی حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ چند ماہ گزار کر پھر ویلور دارالسرور آپہنچے اور بتاریخ ۱۲/شعبان ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء آستانۂ اقطابِ ویلور حضرت مکان کے سجادہ شمس العلماء سید شاہ رکن الدین محمد قادری (متوفی ۲۰/رمضان ۱۳۲۵ھ) ابن حضرت قطبِ ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) ناظم دارالعلوم لطیفیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے ادعیۂ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر کتب اوراد و وظائف کی اجازت حاصل کی۔ پھر اسی سال دو ماہ بعد ۷/ذوقعدہ ۱۳۲۵ھ کو دوبارہ حضرت مکان ویلور حاضر ہوکر دارالعلوم لطیفیہ کے صدرالمدرسین محدث کبیر علامہ فقیہ الحاج محمد محی الدین حسین شافعی سے احادیث مسلسلات کی سندیں بالخصوص ''الحدیث المسلسل بالمصافحہ بروایۃ شمہورش الجنی (متوفی ۱۱۲۹ھ)(۷۲) الصحابی رضی اللہ عنہ'' کی سند پانے کی سعادت حاصل کی۔(۷۳) انہیں دنوں مولانا عبدالہادی نے شہر ویلور کے قریب شہر میل و شارم میں فروکش محدثِ جلیل، فقیہ و صوفی علامہ شاہ محمد خورشید اللہ مدراسی حنفی صدرالمدرسین مدرسہ ''خیر جاری'' میل وشارم سے متعدد مرویات کی سندیں حاصل کیں، حضرت خورشید اللہ قادری نے اپنے مرشد و شیخ خانوادۂ امام المدرسین مولانا محمد حسین شہید بیدریؒ (شہادت ۱۱۰۸ھ) کے چشم و چراغ شیخ محمد گیسودراز قادری بن حضرت خواجہ محی الدین قادری (متوفی ۱۲۶۷ھ) کے دست مبارک پر بیعت کی۔(۷۴) حضرت گیسودراز نے سراج العلماء علامہ محمد شہاب الدین مدراسی (متوفی ۱۲۹۰ھ) مدرس مدرسۂ کلاں، مدراس کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا اور علامہ شہاب الدین نے ملک العلماء ابومحمد عبدالعلی معروف بہ بحرالعلوم (متوفی ۱۲۲۵ھ) سے علوم معقولات و منقولات میں مہارت حاصل کی تھی۔(۷۵)

مولانا عبدالہادی ویلور کی مصروفیت سے فراغت کے بعد حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ چنانچہ جب ارکان حج سے فارغ ہوگئے تو محدث جلیل شیخ عبدالرزاق بیطار دمشقی سے ۲۳/ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ کو کتب اصول و فروع کی سندیں حاصل کیں۔ یہاں عطا کی گئی سند کی نقل نمونتاً پیش کی جارہی ہے تاکہ مولانا عبدالہادی کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوسکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد و علیٰ

اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین امابعد، فقد اجزتُ العلامۃ الواعظ النجیب الفھامۃ الکامل الاریب الشیخ محمدعبدالھادی المدراسی بکل ماتجوزلی روایتہٗ وصحتُ لی درایتہٗ من العلوم لاسیّما بالحدیث والتفسیر والفقہ والاصول وغیر ذٰلک اجازۃ عامۃ تامّۃ شاملۃ بالشرط المعتبر عنداھل الاثرحسب ماجازنی جمع من مشائخی، منھم والدی السیدحسن البیطار الدمشقی الشافعی عن شیخہ الشیخ عبدالرحمٰن الکزبری المحدث و عن شیخہٖ الشیخ حسن العطار الازھری المصری عن العلامۃ الامیرالکبیر ومن مشائخی الشیخ ابراھیم السقاشیخ الازھروالسید عبدالقادر المجاھد الشریف الحسن واوصیہ بالتقویٰ فی السر والنجوٰی وان لا ینسانی من صالح دعائہٖ فی خلواتہٖ وجلواتہٖ لاسیمابحسن الختام والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنامحمد واٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین والحمدللہ ربّ العالمین وحرّرفی ۲۳؍ذی الحجہ الحرام ۱۳۲۵ھ امربرقمہٖ العبدالراجی من ربّہ لطفہ الخفی عبدالرزاق البیطار۔ (۴۶)

مولانا عبدالہادی نے علوم حدیث کا بیڑا یہ کہہ کر اٹھایا تھا کہ وہ ان علوم کو سلف صالحین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے درجۂ کمال تک پہنچائیں گے،خصوصاً سلاسل واسانید کی ترتیب وتدوین ان کی زندگی کا واحد مقصد رہ گیا تھا،یہ کوئی آسان بات نہیں تھی،اس کامیابی کے لیے محدثین کرام سے ملاقاتیں شرط اولین تھی۔یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس وقت دور دراز کے ان شہروں کا دورہ کیا جہاں سفر کی سہولتیں عنقا تھیں۔انہوں نے گجرات،دہلی،میرٹھ مرادآباد،گنگوہ وغیرہ علاقوں میں اکابر سے ملاقاتیں کیں اورحصولِ اسناد کی راہ کی دشواریوں کا آج اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ان کے مختلف اسفار کا ذکر کتاب ’’ہادی المسترشدین الی اتصال المسندین‘‘ میں جستہ جستہ مرقوم ہے۔جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی فکر کا محور ’’جمع الاسانید‘‘ کا عمل تھا اوراس کی تہہ میں صرف حُبّ نبیؐ کا جذبہ تھا۔لکھتے ہیں:

’’یہ ایسا شریف علم ہے کہ اس کے حاصل کرنے والے کورسول اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم سے ایک عظیم الشان تعلق اور حقیقی واسطہ پیدا ہوتا ہے، گویا ایک زنجیر کی کڑیوں میں اپنی کڑی داخل ہوگئی اور یہاں سے وہاں تک ایک ہی سلسلہ قائم ہوگیا۔ یہ ایسا نفیس علم ہے کہ ہر عالم وفاضل وکامل اس کے ذائقہ ولطف حاصل کرنے کے بعد اس کا حریص ہوجاتا ہے، اپنے رسول علیہ السلام کے دور افتادگوں کو قریب کرنے والا اور دُررِ منتشر کو سلک واحد میں ملانے والا یہی علم لطیف ہے، علم درایہ کا زیور اور کلام رسول انام علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچنے کا زینہ یہی علم ہے، علم حدیث کا دارومدار اسی مبارک علم پر ہے، اس کو قوائم دین کہیں تو بجا ہے۔" (۷۷)

ہمیشہ سند عالی کی تلاش کا مقصد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرب تھا: "والعلوفی الاسناد امر محبوب و مرغوب فیہ عند المحدثین بحیث یحصل بالسند العالی القرب من رسول رب العالمین" مولانا نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جب وہ مکۂ مکرمہ میں تھے تو عید کے دن اپنے شیخ علامہ مفتی صالح کمال، امام وخطیب ونیز مدرس مسجد حرام کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں آپ کے پاس عید کے دن کی حدیثِ مسلسل آپ کی زبانِ مبارک سے سننے کی خواہش میں حاضر ہوا ہوں۔ یہ سن کر حضرت شیخ نے ارشاد فرمایا میں نے آج تک اپنے کسی شیخ سے عید کے دن کی حدیث شریف روایت کرتے ہوئے نہیں سنا، یہ کہہ کر شیخ نے توقف فرمایا پھر کہا، اگر تمہیں اس طرح کی حدیث شریف معلوم ہو تو سناؤ، مولانا عبدالہادی کہتے ہیں کہ میں نے حدیث شریف سنائی تو شیخ نے دریافت کیا کہ یہ حدیث تم نے "یوم العید" کس شیخ سے سنی ہے؟ مولانا نے عرض کیا یا سیدی! میں نے یہ حدیث شریف اپنے شیخ علامہ حبیب حسین حبشی سے عید کے دن سنی تھی، یہ سن کر شیخ نے کہا تم نے حضرت حبشی سے حدیث سنی تو وہ تمہارے شیخ ہوئے اور میں نے یہ حدیث شریف تم سے سنی، اس لیے اب تم میرے شیخ ہوگئے ہو۔ مولانا کہتے ہیں کہ میں نے شیخ سے یہ بات سنی تو حیرت زدہ ہوکر کہا "سبحان اللہ" یہ کیسے ہوگا؟ میں تو آپ کا ادنیٰ شاگرد ہوں، شیخ نے فرمایا میں اس حدیث شریف کی سماعت سے تاحال محروم تھا، تم نے مجھے اس حدیث کی نعمت عطا کردی ہے۔ (۷۸)

مولانا عبدالہادی مکۂ مکرمہ سے حیدرآباد تشریف لائے اور پھر دو سال دو ماہ بعد منگلور (موجودہ صوبہ کرناٹک) کا دورہ کیا جہاں قصبہ "کانجرود" میں ۹۵ رسال کے بزرگ محدث علامہ سید علی مرتضیٰ

رفاعی سیوطی مصری (ولادت ۱۲۳۳ھ) تلمیذ شیخ الاسلام مصطفیٰ البکری سے بتاریخ ۴؍ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ تمام مرویات شیوخ کی اجازت حاصل کی۔(۷۹)

منگلور سے واپسی کے بعد اسی سال شمالی ہند کے دورے کا آغاز فرمایا، چنانچہ ۲؍جمادی الاولیٰ ۱۳۲۸ھ کو شہر میرٹھ پہنچے، وہاں علامہ محدث زماں شیخ عبدالمومن بن منشی فہیم الدین میرٹھی تلمیذ قطب الارشاد حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (متوفی ۱۳۱۳ھ) کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے مرویات و اوراد کی سندیں پائیں، خصوصاً شیخ نے ان کو ''حدیث جن'' ''مَن قُتل بغیر زیّہٖ فدمہٗ ھدر'' کی اجازت مرحمت فرمائی، یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مذکورہ حدیث ایک مشہور قصہ سے وابستہ ہے وہ یہ کہ شاہ اہل اللہ صاحب بن شاہ عبدالرحیم دہلوی نے ایک سنپولے کو مارا تھا جو ان کے قریب سے گزر رہا تھا، وہ درحقیقت جن زادہ تھا، اس حادثہ کے بعد گرفتار کرکے جنات کی جماعت نے ان کو اپنے قاضی کے روبرو پیش کیا تاکہ شاہ صاحب پر حکم شرعی نافذ کیا جائے اور سزا سنائی جائے، اس وقت جنات کے قاضی صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ''شمہورش'' رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، جنھوں نے تقریباً ایک ہزار دوسو سال سے زائد عمر پائی تھی۔ حضرت جنّی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتے ہوئے فیصلہ صادر کیا کہ کوئی بھی اپنی اصلی شکل بدل کر دوسری شکل وصورت میں ظاہر ہوکر مارا جائے تو قاتل پر اس کا خون معاف ہے، قاتل کو سزا نہیں دی جائے گی، یہ کہہ کر حضرت جنّی نے شاہ اہل اللہ کو بری کردیا۔(۸۰)

مولانا عبدالہادی نے میرٹھ سے مرادآباد کا سفر کیا، جہاں کابل سے ہجرت کرکے مرادآباد میں قیام پذیر محدث وشیخ مولانا سید محمد گل بن سید خاں کابلی مرادآبادی، مدرس مدرسہ امدادیہ، مرادآباد سے کئی ملاقاتیں کیں۔ حضرت سید محمد گل، امام وخطیب و مدرس مسجد الحرا سید محمد مکی کے شاگرد رشید اور اصح الاسانید، کے مصنف تھے، شیخ نے اپنے 'ثبت' کے تمام مرویات اور دیگر کتب حدیث وتفسیر وفقہ کی اسناد مولانا عبدالہادی کو عطا کیں۔ بعدازاں گنگوہ کے لیے روانہ ہوئے، یہ وہی گنگوہ تھا جس کی زیارت مولانا نے اپنی جوانی میں کی اور علامہ رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ) کی مبارک صحبتوں سے فیضیاب ہوئے تھے، ان دنوں گنگوہ میں محدث شیخ الشیوخ حسن بن علی النظیر النعمانی القدوسی کی شہرت تھی اور ان کی تصنیف ''الدُرّ الفرید فی معرفۃ الاسانید'' کا چرچا اہل علم کے درمیان ہو رہا تھا، مولانا نے

شیخ حسن بن علی کی خدمت میں حاضر ہوکران سے ''ثبت'' کی مرویات کی اجازت حاصل کی، شیخ حسن بن علی کے اساتذہ مین شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکی، مولانا محمد یعقوب دیوبندی صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ حسین بن محسن انصاری خزرجی یمانی نزیل بھوپال کے علاوہ عمدۃ المشائخ والعلماء شیخ علیم الدین ابن شیخ الشیوخ شاہ محمد رفیع الدین قندھاری بھی ہیں۔ شاہ رفیع الدین قندھاری حیدرآبادی (متوفی ۱۳۴۱ھ) مصنف ''ثمرات مکیہ'' دکن کے بلند پایہ صوفی، علامۂ زماں ومحدث دوراں تھے، علاوہ ازیں وہ قطب الاقطاب حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ (متوفی ۱۱۹۸ھ) کے خلیفۂ خاص تھے۔ (۸۱) شاہ رفیع الدین سے دکن کے اکثر شیوخ نے استفادہ کیا ہے، ان میں سے محدث جلیل سید محمد صالح رضوی بخاری اوران کے صاحبزادے محدث کبیر شاہ علیم الدین بن شاہ رفیع الدین (۸۲) بہت مشہور ہوئے۔

مذکورہ دونوں محدثین میں سے اوّل الذکر سے مولانا عبدالہادی کے شیخ علامہ ابوالفضل محمد عبدالستار صدیقی حنفی نے شرف تلمذ حاصل کیا۔ بتاریخ ۱۰/ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ بروز پنجشنبہ بمقام ''منیٰ'' مولانا عبدالہادی اوران کے دونوں فرزند مولانا عبدالمجیب اور مولانا عبدالرقیب کو ''حدیث الرحمۃ المسلسل بالاولیہ'' ودیگر تمام مسموعات ومقروآت کی اجازت واسناد سے سرفراز فرمایا تھا۔ (۸۳) اور مذکورہ دونوں محدثین میں سے ثانی الذکر محدث شاہ علیم الدین بن شاہ رفیع الدین کے روبرو مولانا عبدالہادی کے شیخ حسن بن علی نعمانی نے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ (۸۴)

شمالی ہند کے اسفار کے بعد مولانا عبدالہادی ''کوچین'' (ملیبار) آکر اقامت گزیں ہوگئے، وہاں انہوں نے اواخر ۱۳۲۸ھ تا ۱۳۳۲ھ مکمل چار سال گزارے۔ کوچین میں چند دیندار و بلند کردار تاجروں محترم زکریا بن الحاج عبدالستار، عمر بن الحاج ایوب اور یونس بن الحاج ہاشم نے مل کر ایک تعلیمی ادارہ قائم کررکھا تھا۔ جہاں مولانا خدمت تدریس وتقریر پر مامور ہوئے، وہیں ایک بزرگ الحاج حافظ شیخ علی بن سلطان بن رحمت (۱۲۷۸ھ تا ۱۳۵۳ھ) فارسی شافعی مقیم تھے، مولانا عبدالہادی نے مذکورہ بزرگ سے مختلف علوم وفنون کی اجازت لینے کے ساتھ ہی راہِ سلوک وطریقت میں بھی انہیں اپنا رہنما بنایا، جب کوچین سے دوبارہ حیدرآباد تشریف لے آئے تو حضرت شیخ علی بھی ان کے ہمراہ آگئے۔ چنانچہ شیخ کا قیام ان کے ساتھ ہی ایک مدت تک رہا، بعدازاں شیخ علی کوچین لوٹ گئے، جہاں ان کا

انتقال ۱۳۵۳ھ میں پچھتّر سال کی عمر میں ہوا۔(۸۵)

مولانا عبدالہادی کا شوق طلب بھی عجب تھا۔ چنانچہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں یہ سنا کہ عابدو زاہد، تارک الدنیا صاحب ورع محدث شیخ محمد بن حامد احمد حنفی حسنی ''جبل ابی القُبیس'' میں مقیم ہیں تو ان کی خدمت میں حاضر ہوکر بتاریخ ۱۳؍صفر ۱۳۲۵ھ بروز پنجشنبہ ان سے احادیث وروایات سنیں اور سندیں حاصل کیں۔(۸۶) اسی طرح محدث ومفسر اور فقیہ وصوفی علامہ ابومحمد عبدالحق بن محمد امیر الحقانی حنفی دہلوی کی شہرت سنی تو ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرکے دکن (حیدرآباد) سے دہلی پہنچ کر ان کے دولت کدے پر حاضری دی، شیخ حقانی نے بتاریخ ۱۸؍جمادی الاولیٰ ۱۳۲۸ھ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم وفنون میں خصوصی اجازت عطا کی۔(۸۷)

کوچین سے حیدرآباد آجانے کے بعد سرکاری مصروفیات کی وجہ سے ان کو سفر کی فرصت نہیں ملی، پورے پانچ سال گزر گئے۔ایک بار پھر طلب علم کا جذبہ ابھرا اور گجرات کے شہر ''راندیر'' (نزدِ سورت) کا رخ کیا، جہاں علامۂ زماں محدث دوراں شیخ قاضی سید رحمت اللہ بن قاضی سید احمد اللہ حنفی قادری راندیری کا فیض جاری تھا۔مولانا عبدالہادی نے بتاریخ ۱۶؍ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ علامہ رحمت اللہ سے صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث کی سندیں حاصل کیں اور پھر حیدرآباد لوٹ آئے۔(۸۸) تقریباً دو سال گزرے تو حسنِ اتفاق سے ماہ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں مشہور محدث حضرت مولانا شیخ محمد قیام الدین عبدالباری لکھنوی سے ملاقات ہوئی تو شیخ موصوف سے ''حدیث مسلسل بالاولیۃ'' کی سماعت کی اور شیخ کی تصنیف ''الباقیات الصالحات'' کی اجازت بھی حاصل کی۔(۸۹) اسی دوران محدث اعظم شیخ الحرمین شریفین علامہ شیخ محمد خضر بن مایابی مالکی شنقیطی مدنی ماہ شوال ۱۳۴۰ھ میں حیدرآباد (دکن) تشریف لائے، مولانا نے ان سے ۸؍شوال کو کتب حدیث وتفسیر اور کتب اصول الحدیث واصول الفقہ کی خصوصی اجازت پائی۔(۹۰)

مولانا عبدالہادی کے حالات سے کئی حیرت انگیز باتیں معلوم ہوتی ہیں، جیسے انہوں نے علامہ الحاج حکیم شیخ محمد یعقوب علی ابن شیخ حیدر علی دہلوی مدنی سے حیدرآباد (دکن) میں ملاقات کی۔ اس وقت شیخ بہت معمر تھے، شیخ یعقوب علی نے براہِ راست حضرت شاہ اسحاق محدث دہلوی (متوفی ۱۲۶۲ھ) سے فیض پایا تھا۔اس طرح شاہ ولی اللہ اور مولانا عبدالہادی کے درمیان صرف تین واسطے

ہوئے، جس سے یہ سند عالی ہوئی۔ علامہ شیخ یعقوب علی نے چھ سو سالہ (۶۰۰) انتہائی عمر رسیدہ محدث شیخ عبداللہ شجری نجدی یمنی ابن شیخ شریف شجری معاصر علامہ جارُاللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) صاحب تفسیر کشّاف سے حدیثوں کی روایت کی تھی، یہ بات انتہائی تعجب خیز ہے کہ جنّات کے علاوہ انسانوں میں بھی صدیوں کی عمر پانے والے اشخاص قریبی دور میں موجود تھے۔(۹۱) دوسرا واقعہ یہ کہ مولانا عبدالہادی کے شیوخ میں محدث جلیل حافظ الحدیث والقرآن شیخ محمد عثمان مدراسی بھی ہیں، جن کی شادی کے لیے ان کے خسرِ محترم نے یہ شرط لگائی کہ تیس ہزار حدیثیں (۳۰۰۰۰) حفظ ہوں تو لڑکی دیں گے، چنانچہ شیخ عثمان نے تیس ہزار احادیث اپنے خسر علامہ نواب خاں عالم خاں فاروقی مدراسی (متوفی ۱۲۷۱ھ) خلیفہ حضرت مولانا سید محمد علی رامپوری (متوفی مابعد ۱۲۵۱ھ) کو زبانی سنائیں تب جا کر نواب مذکور نے شیخ موصوف کو اپنی دامادی میں لیا۔(۹۲)

محدث جلیل مولانا عبدالہادی کو جمع اسناد سے فراغت کے بعد خیال آیا کہ اس مؤقر تصنیف پر علمائے کبار کی تقاریظ حاصل کی جائیں۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے ۲۵؍ربیع الاوّل ۱۳۴۰ھ کو علامہ محدث کبیر محمد قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی (متوفی ۱۳۴۴ھ) سے تقریظ حاصل کی، شیخ عبدالباری نے اسم گرامی کے ساتھ "المحدث الجامع الکامل والشیخ الواصل الحضرۃ العلامۃ الشیخ عبدالھادی المدراسی الحیدرآبادی حفظہ اللہ" کے القاب استعمال کیے ہیں۔ اس واقعہ کے پانچ سال بعد ۱۳۴۶ھ میں حیدرآباد سے ویلور روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر مدرسہ باقیات صالحات (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کے صدرالمدرسین علامۂ زماں شیخ العلما محدث دوراں شمس العلماء شیخ عبدالجبار قادری ویلوری خلیفہ بانیٔ باقیات شمس العلما علامہ شاہ عبدالوہاب قادری نقشبندی سے ملاقات کی، حضرت صدرالمدرسین نے کتاب اور صاحب کتاب کی تعریف وتوصیف فرماتے ہوئے تحریر فرمایا:

"فانّی طالعت کتاب "ھادی المسترشدین الیٰ اتصال المسندین"
فقد وجدتہٗ بحراً موّجاً بِدُرر الاسانید و کنزاً مشحوناً بجواھر المسانید،
ما رأیتُ قط قبل ھٰذا کتاباً جامعا بعلم الاسناد و مقرّباً للمراد فی
رفع الاسناد، احی بہ المصنف العلام الفاضل المتوقد القمقا
شمس الواعظین وبدر الکاملین حاج الحرمین الشریفین المتحلّی

بزیارۃ سید الکونین صاحب القبلتین ﷺ حبینا المکرم صدیقنا المعظم حافظ القرآن المجید والماھر فی القرأۃ والتجوید واقف اسرار الشریعۃ الغرّاء حامی الملۃ البیضاء فصیح اللسان طلیق البیان فی المجالس والنوادی المولوی محمد عبد الھادی ھدیٰ بہ اللہ اھل الامھار والبوادی۔''(۹۳)

مذکورہ اکابر کے علاوہ علامہ محدث شہیر شیخ عبدالرحیم ویلوری (متوفی ۱۳۶۶ھ) ناظر و مہتمم مدرسۂ باقیات صالحات، خلیفۂ مولانا شاہ خلیل احمد انبیٹھوی (متوفی ۱۳۴۶ھ)، علامہ شیخ عبدالصمد علمی مدرس مدرسۂ باقیات وخلیفۂ بانیٔ باقیات (متوفی ۱۳۶۵ھ) سے تقاریظ حاصل کیں۔ حیدرآباد میں ۲۵؍شوال ۱۳۴۶ھ کو مفتی مدرسۂ نظامیہ حیدرآباد علامہ سید محمد مخدوم حسینی سے اور مدرسۂ نظامیہ ہی کے صدر المدرسین علامہ محمد یعقوب شیخ الحدیث سے بھی تقریظیں لکھوائیں۔ اسی طرح ۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا سید محمد رشید قادری بغدادی، خطیب مکہ مسجد، حیدرآباد، اور علامہ شیخ عبداللہ عمادی، ناظر کتب مذہبیہ درسیہ دارالترجمہ سرکارعالی، حیدرآباد وغیرہ سے بھی ان کی آرا حاصل کیں، پھر ۱۳۴۸ھ میں علامہ شاہ محمد عبدالقادر صوفی بنگلوری ابن علامہ شاہ عبدالحی احقرؔ بنگلوری، واعظ سرکار نظام، حیدرآباد اور علامہ شیخ سالم باخطاب شافعی شیخ الشافعیہ، مدرسۂ نظامیہ وغیرہ سے ان کے خیالات معلوم کئے اور انہیں اپنی کتاب کا حصہ بنایا، پھر ۱۸؍ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ کو علامہ محمود حسن ٹونکی مصنف ''معجم المصنّفین'' کی تقریظ موصول ہوئی جس میں علامہ نے مولانا عبدالہادی کی خدمات کا اعتراف کیا، اسی سال مولانا عبدالہادی نے وانمباڑی کا دورہ کیا جہاں ان کے شفیق استاذ علامہ عبدالمجید پنگنوری (متوفی ۱۳۵۳ھ) کی قائم کردہ درسگاہ ''مدرسۂ نسواں'' (قائم شدہ ۱۳۳۸ھ) کا معائنہ کرنے کے بعد ''کتاب الآرا'' میں اپنے تاثرات قلم بند کیے، اس پر تاریخ ۲۲؍شوال ۱۳۵۱ھ (مطابق ۱۹۳۲ء) درج ہے۔(۹۴) علاوہ ازیں ان کے ایک اور استاذ مولانا شیخ الکل شیخ عبدالرحیم مہتمم ''مدرسہ مفید عام'' وانمباڑی کی ۱۳۵۵ھ میں تحریر کردہ تقریظ کتاب ''ہادی المسترشدین'' کے آخر میں شامل کی گئی ہے اور اسی سال کتاب کی اشاعت بھی ہوئی ہے۔

یہ بیش بہا تصنیف ''ھادی المسترشدین الیٰ اتصال المسندین'' الملقب ''بتقریب المراد فی رفع الاسناد'' جو سات سو اسی (۷۸۰) صفحات پر مشتمل ہے، شاہ دکن آصف سابع نواب

میر عثمان خاں بہادر (متوفی ۱۳۸۶ھ) کے توجہ خاص وتعاون خصوصی سے جشن سیمیں کی تقریب کے موقع پر مطبع حمایت دکن، سلطان بازار، حیدرآباد، سے طبع ہوئی تھی، مصنف علامہ محدث جلیل حافظ قاری ابوسعید عبدالہادی مسکین پلی کنڈوی نے اس معرکہ آرا کتاب میں احادیث شریفہ کی جملہ سندیں چھتیس سالہ (۱۳۱۶ھ تا ۱۳۵۲ھ) عرصے میں محنت شاقہ سے جمع کیں۔ پھر ایک سال کی مدت میں اس جمع شدہ مواد کو مسودے کی شکل دی گئی بعدازاں مصنف علیہ الرحمہ کو اس کی ترتیب وتدوین اور تبییض سے فراغت کے لیے مکمل دوسال لگ گئے۔(۹۵) اس کے بعد اس کی طباعت ۱۳۵۵ھ میں مصنف کی زندگی میں ہوئی۔ اس لیے مصنف ''نشر الجواہر والدرر'' (فی علماء القرن الرابع عشر) ڈاکٹر یوسف مرعسلی، استاذ حدیث وفقہ، کلیۃ الشرعیہ، جامعہ بیروت (مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۰۰۶ء ص:۱۳۲۷) کا یہ کہنا کہ علامہ ابوسعید عبدالہادی کی وفات ۱۳۵۰ھ کے قریب ہوئی ہے، صحیح نہیں۔(۹۶) مولانا عبدالہادی ۱۳۵۵ھ تک باحیات تھے اس کے بعد انتقال ہوا، البتہ متعین تاریخ کا پتہ نہ چل سکا۔

مولانا عبدالہادی نے اس ثبت میں اپنے پچپن شیوخ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ کتاب کی ترتیب مکی شیوخ اور مدنی شیوخ کو الگ الگ شامل کیے ہوئے ہے۔ مشائخین طریقت اور اساتذہ کرام کا بھی علاحدہ تذکرہ کیا ہے۔ ان کے دور میں اسانید وسلاسل پر مشتمل دیگر محدثین کرام کی کتابیں بھی موجود تھیں، جیسے علامہ قاضی القضاۃ ارتضی علی خان بہادر خوشنود (۱۱۹۸ھ تا ۱۲۷۰ھ) ابن مولانا مصطفیٰ علی خاں بہادر خوش دل (متوفی ۱۲۳۴ھ) کی کتاب ''مدارج الاسناد'' قاضی بدرالدولہ (۱۲۱۱ھ تا ۱۲۸۰ھ) کی تصنیف الثبت فی اسانید الحدیث اور کتب خانۂ آصفیہ (موجودہ اورینٹل میانسکرپٹ لائبریری) حیدرآباد کا مخزونہ ''النفح المسکی بمعجم شیوخ المکی'' جس کے مؤلف مولانا عبدالہادی کے شیخ علامہ ابوخیر جمال بن عثمان بن علی مکی احمدی ہیں اور جس کا مطالعہ خود مولانائے موصوف نے کیا تھا۔ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود یہ کتابیں ''مولانا کی تصنیف'' ہادی المسترشدین'' (۹۷) کی سی اہمیت نہ پاسکیں، وجہ یہی ہے کہ مولانا نے اپنی کتاب کو تاریخی حوالوں سے اس طرح مزّین کیا کہ وہ تاریخی دستاویز بن گئی۔ اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریظ میں لکھا:

''انہوں نے (مولانا عبدالہادی نے) اپنی تمام اسنادِ تعلیم وکتب نہایت خوش

اسلوبی کے ساتھ جمع کردی ہیں اور کوشش فرمائی ہے کہ تمام سلاسل اسناد اس طرح مرتب کردیے جائیں کہ ان کے مطالعہ سے ان کی تاریخی حیثیت بھی واضح ہوجائے۔"

(ہادیٔ المسترشدین:۳۷)

مولانا عبدالہادی نے اس مؤقر ثبت کے علاوہ دیگر کتابیں بھی تصنیف کیں ان میں "ھادی الطالبین الی مسلسلات النبی الامین" المعروف "مسلسلات المسکین" کا ذکر ہادی المسترشدین میں موجود ہے (ص:۱۰) یہ بات ذہن نشین رہے کہ مولانا عبدالہادی کا تخلص "مسکین" ہے اور موصوف استاذِ نظام آصف جاہ فصاحت جنگ جلیل مانک پوری (متوفی ۱۳۶۵ھ) کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ مولانا کے ثبت کے آخر میں حضرت جلیل نے تاریخی قطعہ کہا ہے: ملاحظہ ہو ؎

"کیا مقدس ہے کتاب لاجواب جس پہ قدسی کرتے ہیں آنکھوں سے صاد
ہیں مصنف اس کے فخرالواعظین پاک دل، پاکیزہ سیرت، خوش نہاد
عبدہادی عالمِ فقہ و حدیث مصحف باری تعالیٰ جن کو یاد
حاجی و قاری بھی خوش آواز بھی انکسار طبع اس پر مستزاد
ان کی یہ تصنیف ہو مقبول عام یا خدائے ذوالمتین، ربّ العباد
فیض سے اس کے وہ پھیلے روشنی جس سے ہوں پُرنور امصار و بلاد
مصرع تاریخ لکھ روشن جلیل ہے سراج دین یہ تقریب المراد"

۱۳۴۶ (فصلی سال)

راقم یہیں اپنی بات ختم کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف علیہ الرحمہ کے درجات کو بلند کرے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین، بجاہ سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین، برحمتك یاارحم الراحمین، والحمدللہ رب العالمین۔

مآخذ وحواشی

(۴۴) اول الذکر کتاب ۱۳۱۲ھ میں مدراس سے شائع ہوئی اور دوسری کتاب مطبع احسن المطابع، متیال پیٹ، مدراس سے ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی۔

راہی فدائی ڈاکٹر'مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے علمی وادبی کارنامے'ٹمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، مدراس،۱۹۹۶ء،ص ۵۶۔

(۴۵)عرب اینڈ پرشین اِن کرناٹک،ص ۵۴۴۔۵۴۵۔۵۴۶۔(۴۶)ایضاً،ص ۵۴۸۔(۴۷)ایضاً، ص ۵۴۰۔(۴۸)مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ تحریر مصنف علامہ محدث مفتی قاری ابوالسعید محمد عبدالہادی مدراسی، واعظ سرکاری عالی، حیدرآباد، دکن کی ضخیم تصنیف ''ہادی المسترشدین الی اتصال المسندین الملقب بہ تقریب المراد فی رفع الاسناد'' (عربی) میں تقریظ کے طور پر شامل ہے۔اوراس پر تاریخ ۱۹/جمادی الثانیہ ۱۳۳۷ھ مرقوم ہے۔مصنفؒ نے مولانا آزاد کے دورۂ مدراس کے موقع پر مذکورہ تحریر حاصل کی تھی۔(۴۹)عبدالقدیر معدنی مولانا ''تاریخ معدن'' ناشرومرتب،عبدالقدیر،مدرس مدرسہ معدن العلوم، وانمباڑی،ضلع ویلور ٹمل ناڈو، مطبوعہ ۲۰۱۷ء،ص ۱۶ونیز مدرسہ معدن العلوم، وانمباڑی کا اجمالی تعارف(کتابچہ)شعبۂ نشرواشاعت مدرسۂ ہذا، مطبوعہ قومی پریس بنگلور ۱۹۷۷ء ص:۹۔(۵۰)محمد عبدالہادی ابوسعید مولانا مفتی حافظ وقاری''ہادی المسترشدین الی اتصال المسندین''، مطبع حمایت دکن، سلطان بازار، حیدرآباد(دکن)مطبوعہ ۱۳۵۵ھ،ص ۲۷۴ تا ۲۷۶۔ (۵۱)یہ نکاح غالباً ۱۳۰۳ھ میں ہوا ہے، یہ اس لیے کہ مولانا محمد عبدالہادی، مصنف کتاب ہذا نے ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں مکہ مکرمہ پہنچ کر وہاں کے محدثین کرام سے کتب حدیث ودیگر مرویات کی سندیں نہ صرف خود حاصل کیں بلکہ اپنے صاحبزادوں کو بھی سندیں دلوائیں، یہ بات مسلم ہے کہ حدیث کی سند اسی شخص کو دی جاتی ہے جو کتب حدیث پڑھ چکا ہو، اس صورت میں مذکورہ دونوں فرزندوں (مولانا عبدالمجیب اور مولانا عبدالرقیب) کا کتب حدیث سے واقف ہونا لازمی ہے، یہ عین ممکن ہے کہ والد ماجد مولانا عبدالہادی صاحب کی معیت میں مکہ مکرمہ حاضر ہوتے وقت ان کی عمریں اٹھارہ اور بیس سال رہی ہوں۔اگر حصول سند کے سال ۱۳۲۴ھ میں عمر کے ۲۰ سال منہا کردیں تو ۱۳۰۴ھ باقی رہے گا اور یہی ان صاحبزادوں کی ولادت کا سال مانا جائے گا، اس حساب سے مولانا محمد عبدالہادی صاحب کا نکاح سنہ ۱۳۰۳ھ یا ۱۳۰۲ھ میں ہونا قرین قیاس ہے۔ (۵۲)''ہادی المسترشدین الیٰ اتصال المسندین''ص ۹۸،ص ۱۱۳(حاشیہ)۱۷۹۔۲۰۱۔(۵۳)''مدرسہ معدن العلوم وانمباڑی کا اجمالی تعارف'' ص ۵۔(۵۴)''ہادی المسترشدین''، ص ۲۷۶۔(۵۵)''جلال عرفان، وانمباڑی اور اس کے نواح میں علم وادب کی خدمات'' مطبوعہ اسلامیہ کالج وانمباڑی کی ادبی اشاعت نمبر ۳ فروری ۱۹۸۸ء بعنوان ''مولانا عبدالمجید خاں پنگنوری'' از مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری،ص:۲۱۔(۵۶)''ہادی

المسترشدین''ص ۲۶۵-۲۲۷۔(۵۷)ایضاً،ص۲۴۷۔(۵۸)ایضاً،ص ۲۳۰۔(۵۹)ایضاً،ص ۲۴۰۔ (۶۰)ایضاً،ص ۲۶۴۔(۶۱)ایضاً،ص ۵۴۱-۵۴۲۔(۶۲)ایضاً،ص ۲۲۶۔(۶۳)ایضاً،ص ب۔(۶۴)ایضاً، ص ۱۴۸-۱۵۸۔(۶۵)ایضاً،ص ۲۶۹-۲۷۰۔(۶۶)ایضاً،ص ۲۷۰۔(۶۷)ایضاً،ص ۴۸۔(۶۸)ایضاً، ص ۸۳۔(۶۹)ایضاً،ص ۸۴-۸۸۔(۷۰)ایضاً،ص ۲۲۶-۲۲۷۔(۷۱)ایضاً،ص ۲۰۵۔(۷۲)ایضاً، ص ۵۲۷۔(۷۳)ایضاً،ص ۲۶۰-۲۶۷۔(۷۴) خانوادۂ قاضی بدرالدولہ،ص ۸۷۔(۷۵)''ہادی المسترشدین''ص ۲۶۲-۲۶۴۔(۷۶)ایضاً،ص ۲۲۹۔(۷۷)ایضاً،ص ب۔(۷۸)ایضاً،ص ۴۴-۴۵۔(۷۹) ایضاً،ص ۲۴۰۔(۸۰)ایضاً،ص ۲۴۴۔(۸۱)راہی فدائی ڈاکٹر،جنوب کے اصحاب کمال،الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد،مطبوعہ ۲۰۱۹ء ص ۱۲۷۔(۸۲)''ہادی المسترشدین''،ص ۱۶۷-۱۷۶۔(۸۳)ایضاً،ص ۱۷۹، ۱۸۴، ۱۸۵۔(۸۴)ایضاً،ص ۲۴۷-۲۴۸۔(۸۵)ایضاً،ص ۲۵۴-۲۵۵۔(۸۶)ایضاً،ص ۲۰۳-۲۰۴۔(۸۷)ایضاً، ص ۲۴۱-۲۴۲۔(۸۸)ایضاً،ص ۲۳۹۔(۸۹)ایضاً،ص ۲۴۳۔(۹۰)ایضاً،ص ۲۲۳-۲۲۵۔(۹۱)ایضاً، ص ۲۵۹۔(۹۲)ایضاً،ص ۲۶۸۔(۹۳)ایضاً،ص ۳۔(۹۴)محمد عبدالجمیل خطیب اور وجندرم عبدالسلام (مرتبین) آئینۂ وانمباڑی،انجمن خیرخواہ عام وانمباڑی،مطبوعہ ۱۹۷۰ء،ص ۲۲۳۔(۹۵)''ہادی المسترشدین'' ص ابتدائی ''ب''۔(۹۶)نثرالجوہر والدرر'' کا نسخہ راقم کو محترمہ ڈاکٹر لیلیٰ عبدی خجستہ صاحبہ،تہران کے توسط سے دستیاب ہوا۔شکریہ جزاک اللہ۔(۹۷)راقم الحروف مولانا عبدالاحد فلاحی سورتی کا شکرگزار ہے کہ انہوں نے ''ہادی المسترشدین'' کا نسخہ واٹس ایپ کے ذریعہ عنایت فرمایا،جزاک اللہ خیرالجزا۔

ذخیرۂ مولانا غلام جیلانی

ڈاکٹر احمد خان

پاکستان کے تاریخی شہر پشاور کے محلہ آسیا میں ایک قدیم اور پرانی وضع کے مکان میں ایک علمی گھرانہ آباد تھا،(۱) جس کے آخری چشم و چراغ مولانا غلام جیلانی (متوفی ۱۲۹۲ھ) ہوئے۔ اس خاندان کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ اس کے جملہ افراد علم و فضل کے حامل، کتابوں کے شیدائی اور تصنیف و تالیف کے بے حد شائق تھے۔ یہ حضرات خطی کتابوں سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ انہوں نے مخطوطات کا ایک ایسا ذخیرہ جمع کیا جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ اس ذخیرہ میں غلام جیلانی کے دادا مولانا غلام مصطفیٰ تک کے ہاتھوں سے لکھے یا ان کی طرف سے مقابلہ کردہ مخطوطات یا دوسروں سے لکھوائی ہوئی یا نقل کی ہوئی کتابیں ملتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اس خاندان میں غلام مصطفیٰ کے والد یا دادا کے ہاتھ سے نقل کردہ فارسی زبان میں مخطوطات ہوں۔ تاہم مولانا غلام مصطفیٰ سے اس کتب خانے کی ابتدا یقینی نظر آتی ہے کیونکہ انہوں نے سنہ ۱۱۱۱ھ میں ایک کتاب اپنے ہاتھ سے اپنے لیے نقل کی تھی،(۲) جب کہ یہ کتب خانہ اس زمانہ سے پہلے وجود رکھتا تھا۔ قیاساً اس ذخیرے کی ابتدا بارہویں صدی ہجری کے شروع یا گیارہویں صدی ہجری کے آخری سنین میں کی جاسکتی ہے۔ اس امر کا امکان ہے کہ مولانا غلام جیلانی کے پردادا مولانا محمد معظم یا ان کے والد محمد علی نے یہ خطی کتابیں جمع کرنا شروع کی ہوں۔

اس خزانے کی خوش بختی ہے کہ یہ کتابیں خاندان میں پشت در پشت علما و فضلا پیدا ہونے کی بدولت نہ صرف ایک جگہ جمع رہیں بلکہ ان میں ہر دور میں صاحب خانہ کے ہاتھوں جو صاحب ذوق بھی ہوتا تھا، اضافہ ہوتا رہا۔ دنیا میں شاذ و نادر ایسے ذاتی کتب خانے ہوں گے جنہیں جمع کرنے والے اس طرح نسلاً بعد نسلٍ عالم و فاضل ہوتے آئے ہوں، پاک و ہند میں اس کی مثال خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ ہے

مرکز حمایۃ المخطوطات العربیۃ، ۳۲۳۔شہزاد ٹاؤن، اسلام آباد۔

جسے چند پشتوں تک محبان مخطوطات میسر آئے۔(۳)

جیلانی خاندان کی خدمات کتابیں جمع کرنے کے علاوہ معاشرتی جدوجہد پر بھی مبنی رہی ہیں مگر یہاں ان کے ذکر کا مقام نہیں ہے۔(۴) یہ امر واضح رہے کہ اس خاندان کے ہر فرد کی مخطوطات سے والہانہ محبت اور بے پناہ شغف تھا۔نوادر مخطوطات کا جہاں اور جس جگہ پتہ چلتا یہ حضرات خود وہاں پہنچ جاتے، منت وسماجت سے وہ گوہر مقصود حاصل کرنے کی سعی کرتے۔اگر کامیابی نہ ہوتی تو خریدنے کے لیے اچھی خاصی رقم کی پیشکش کرتے اور اگر پھر بھی کامیاب نہ ہوتے تو وہاں بیٹھ کر دن رات نسخے کی نقل خود تیار کرتے یا کسی سے تیار کرواتے۔اگر کوئی صاحب ایسے نسخے ہدیۃً پیش کرتے تو بے حد خوش ہوتے۔یہ بھی پتہ چلا ہے کہ مولانا غلام جیلانی کی ساری جمع پونجی مخطوطات کی خریداری میں لگ جاتی جس سے گھر کا خرچ بھی کبھی کبھی تنگ ہوجاتا۔

اس ذخیرے کی فہرست بنانے کے دوران میں نے دیکھا کہ بیسیوں مخطوطات ضخیم ومختصر، اس خاندان کے مختلف افراد کے ہاتھوں نقل کردہ ہیں۔اگر تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا غلام حبیب نے سب سے زیادہ، مولانا غلام جیلانی نے ان سے کم اور مولانا غلام مصطفیٰ نے سب سے کم کتابیں نقل کی ہیں۔اس ذخیرے کے فارسی مخطوطات کو اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے (جن کو میں نہیں دیکھ سکا) تو مجھے امید ہے مولانا محمد معظم کے ہاتھوں سے نقل شدہ نسخے بھی مل جائیں گے کیوں کہ ان کے زمانہ میں (اندازاً ۱۰۶۰ھ-۱۱۵۰ھ) فارسی زبان سرکاری تھی اور تصنیف وتالیف کی زبان بھی تھی۔

ان حضرات نے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، دیگر علما سے مخطوطات نقل کروائے، چنانچہ کئی نسخوں پر ''استکتبہ فلان'' کی تحریریں موجود ہیں جن میں مولانا غلام جیلانی، مولانا غلام حبیب اور مولانا غلام مصطفیٰ کے اسمائے گرامی متعدد بار نظر آتے ہیں۔یہی نہیں حج کے سفر کے دوران جن علاقوں یا راستوں سے گزر ہوا وہاں بھی نسخے خریدے اور ان جگہوں سے نادر نسخوں کی نقول حاصل کرنے کی سعی بھی کرتے رہے۔۱۲۸۸ھ میں مولانا غلام جیلانی نے سفر حج کیا جس کے احوال انہوں نے ایک رسالے میں لکھے ہیں کہ فلاں کتاب فلاں شخص سے خریدی یا فلاں شخص نے ہدیۃً دی۔(۵)

کئی مخطوطات کے صفحۂ عنوان پر یا آخر میں ''طالعہ غلام جیلانی'' یا ''طالعہ غلام حبیب'' لکھا نظر آیا۔ایسے مخطوطات کسی خاص فن یا مضمون سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ہر فن سے متعلق

ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو ہر فن کے مخطوطات جمع کرنے اور مطالعہ کرنے کا شوق تھا۔

مختلف فنون کے اس بہترین اور بیش قیمت ذخیرے کے دیکھنے کے آرزومند ظاہر ہے کثرت سے تھے لیکن مولانا غلام جیلانی قدر شناسوں کے علاوہ دوسروں کو یہ ذخیرہ دکھانے میں ہچکچاتے تھے۔

پشاور کے مشہور صحاف سعداللہ کی بنی ہوئی عمدہ جلدیں اس مجموعے کے مالک کی گہری توجہ کی غماز ہیں۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ مولانا غلام جیلانی کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ان کی وفات کے بعد اس کتب خانے کی مناسب دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا۔اگرچہ مرحوم کی بیگم اور بیٹیاں اس قیمتی ورثے کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھیں مگر اس کی حفاظت اور دیکھ بھال ان سے ممکن نہیں تھی۔یہ دیکھ کر والی کابل نے اس ذخیرے کو اپنے ہاں محفوظ کرنے کے لیے وارثین کو اس وقت ڈیڑھ لاکھ روپے کی پیشکش کی مگر ماں بیٹیاں اس لیے نہ مانیں کہ (۶) وہ اس بیش قیمت ذخیرے کو اپنے علاقے سے باہر دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔مولانا کی وفات ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء کے برسوں بعد بھی ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء تک یہ ذخیرہ کس مپرسی کی حالت میں بند پڑا رہا۔

۱۹۱۰ء میں پشاور کے مسلمانوں نے ایک تعلیمی درس گاہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔ چنانچہ مولانا فضل واحد حاجی ترنگزی (متوفی ۱۹۳۶ء) کی اخلاقی امداد اور صاحبزادہ عبدالقیوم (متوفی دسمبر ۱۹۳۷ء) کی انتھک کوششوں سے نومبر ۱۹۱۳ء میں موجودہ اسلامیہ کالج کی بنیاد پڑی۔(۷) کالج کے کتب خانہ کے لیے کالج کے انتظامیہ ارکان کی نظر اس کتب خانہ کی طرف گئی اور بہتر سمجھا گیا کہ بورڈ کے سکریٹری صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب مولانا مرحوم کی بیوہ اور بیٹیوں سے درخواست کریں کہ یہ کتب خانہ اس نوزائیدہ کالج کی نذر کردیں۔مولانا مرحوم کے پس ماندگان نے یہ درخواست قبول کرلی اور بالآخر یہ قیمتی ذخیرہ استفادۂ عام کے لیے وقف کردیا گیا اور ۱۹۱۴ء کے ابتدا یا وسط میں آسیا محلہ سے اسلامیہ کالج کے کتب خانے کی موجودہ عمارت میں منتقل ہوگیا۔(۸)

اسلامیہ کالج میں تدریس کے لیے عربی و فارسی اور اردو زبانوں کے ماہر کتاب شناس، عالم و فاضل مولانا عبدالرحیم کلاچوی کا انتخاب ہوچکا تھا۔مولانا کے ذوق کتب بینی کو دیکھتے ہوئے فیصلہ ہوا کہ مولانا کو کتب خانہ کے لیے خاص کردیا جائے۔

مولانا نے سب سے پہلے ایک تفصیلی فہرست کی تیاری پر توجہ کی اور جس حسن وخوبی اور جانفشانی سے یہ فریضہ سرانجام دیا وہ قابل داد ہے۔ان کی خواہش ہوئی کہ اس نادرالوجود ذخیرے سے عامۃ الناس اور خواص کو باخبر کیا جائے، لہٰذا مفصل فہرست سے قبل انہوں نے ایک مختصر سی فہرست ''مکتبہ شرقیہ دارالعلوم اسلامیہ پشاور کے علمی جواہر پاروں کی جلوہ ریزی'' کے عنوان سے اپریل ۱۹۱۶ء میں تیرہ صفحات پر مشتمل ایک تعارف نامہ شائع کیا۔(۹) اس میں کتب خانے کا تعارف اور ۳۶ نادر مخطوطات کا مختصر ذکر تھا۔اس کی اشاعت سے قدر دانوں کی توجہ اور بڑھی اور مفصل فہرست کا مطالبہ شدید تر ہوتا گیا۔تقریباً دوسال بعد مولانا نے مفصل فہرست تیار کر کے آگرہ سے طباعت کے لیے مسودہ روانہ کردیا،جس کا عنوان ''لباب المعارف العلمیۃ فی مکتبۃ دار العلوم الاسلامیۃ'' تھا،اس کی طباعت تقریباً ۱۹۲۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔اس فہرست میں مخطوطات اور مطبوعات دونوں شامل تھے۔مطبوعات کی شمولیت غالباً ان کی اہمیت تھی یا کمیابی تھی یا پھر قدیم فہرست کی ترتیب ہی ملحوظ رہی۔

اس فہرست کے پہلے حصہ میں عربی،فارسی،اردو اور انگریزی زبانوں میں مطبوعات اور مخطوطات کا ۲۰۲۸ نمبر تک کا اندراج ہے۔آخر میں کچھ ضمیمے ہیں جن میں انڈیکس کتب اردو،اسماء مصنّفین بہ حروف تہجی ہیں اور ضمیمہ چہارم میں وہ تصحیحات ہیں جو علامہ عبدالعزیز المیمنی نے عربی مخطوطات کے ضمن میں کی ہیں۔علامہ المیمنی اس وقت ایڈورڈ مشن کالج پشاور میں نئے نئے عربی فارسی استاد مقرر ہوئے تھے۔آخر میں ضمیمہ پنجم میں ان مطبوعہ وخطی کتب کی فہرست ہے جو نمبر ۲۵۱۴ سے ۲۶۴۲ تک ہے۔

مولانا مرحوم کی فہرست کا دوسرا حصہ بہت بعد ۱۹۳۹ء میں چھپا،مگر اس حصہ میں مخطوطات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اس فہرست کے چھپتے ہی شائقین دور دور سے آنے لگے۔بیرون ملک سے بھی شائقین بڑی تعداد میں آ کر اس کلکشن سے حیرت زدہ ہوتے رہے۔(۱۰) غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے کتاب خانے کے لیے قواعد وضوابط کی ضرورت محسوس کی گئی۔چنانچہ ایک دستور ۱۹۲۸ء کی ابتدا میں تیار کردیا گیا۔(۱۱)

استفادہ کرنے والوں میں کارل بروکلمان بھی ہیں جنھوں نے کتاب تاریخ ادب عربی کی ترتیب میں اس فہرست سے کام لیا۔یہاں یہ کہنا مناسب ہے کہ کتب خانہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں

اضافہ مسلسل ہوتا رہا اور اس کی کئی فہرستیں مختلف حضرات تیار کرتے رہے،(۱۲) وقت کے ساتھ یہ ضرورت بھی سامنے آئی کہ یہ فہرست جدید اصول وقواعد کے مطابق بھی ہو۔(۱۲)

چنانچہ عربی زبان میں اس مجموعے کی مفصل فہرست اس ناچیز نے تیار کی جو مکتبة الملك فهد الوطنيه، الرياض (السعودية) سے ۲۰۰۵ء میں چھپی۔(۱۳)

اوپر گزر چکا ہے کہ اس فہرست کی تیاری میں سب سے بڑا حصہ مولانا عبدالرحیم (متوفی ۱۹۵۰ء) کا ہے۔ الفضل للمتقدم، طباعت کے وقت علامہ عبدالعزیز المیمنی (متوفی ۱۹۸۷ء) جو پشاور میں موجود تھے، انہوں نے اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے درست طلب مقامات کی نشاندہی کی اور جو تکمیل طلب امور تھے انہیں مکمل کیا۔ ان حضرات کے علاوہ اس ذخیرے کو ایک اور عربی وفارسی دان علامہ عبدالقدوس قاسمی (۱۴)(متوفی ۱۹۸۸ء) بھی میسر آئے، جنہوں نے کئی مخطوطات کی ابتدا اور انتہا کا تعین اس صورت میں کیا کہ نسخے کے شروع اور آخر میں اس کا عنوان اور نمبر لکھ دیا۔ اس امر کی تعیین کوئی معمولی کام نہیں ہے، اس میدان میں ماہرین فن تک ٹھوکریں کھا جاتے ہیں اور بعد میں اضافہ کردہ اوراق کو بھی مخطوطات کا حصہ شمار کرنے لگتے ہیں۔ جس عرصے (۲۰ مئی ۱۹۹۸ء تا ۲۰ فروری ۱۹۹۹ء) میں مجھے اس ذخیرے کو دیکھنے کا موقع ملا، میں نے بھی مقدور بھر کئی مجہول الاسم مخطوطات کے عناوین اور کئی مخطوطات کے مولفین وشارحین کا تعین کرنے میں مقدور بھر کوشش کی۔ کچھ عربی مخطوطات کے عناوین اور ان کے مولفین کے اسماء کی تصحیح کا بھی کام کیا۔ کچھ مطبوعہ کتب کے ہمراہ مخطوطات مجلد تھے، ان کا ذکر علامہ عبدالرحیم سے رہ گیا تھا۔ ان کی تفصیل بھی دی ہے۔ اس کے علاوہ کافی مخطوطات، مجموعات کی صورت میں تھے، ان کا ذکر مولانا مرحوم نے صرف پہلے خطی نسخے کے عنوان سے کر دیا تھا، جب کہ میں نے اس مجموعے میں موجود جملہ مخطوطات کی تفصیل دینے کی سعی کی ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام مکمل نہیں ہے، اس میدان کے متخصصین حضرات سے توقع کی جاتی ہے کہ اس فہرست کی خامیاں دور کرنے میں وہ بھی اپنا کردار ادا کرتے ہوئے ہماری مدد فرمائیں گے۔(۱۵)

مولانا عبدالرحیم کی محنت کی قدر کرتے ہوئے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جس نکتۂ نظر سے ہم نے اس مجموعے کو دیکھا ہے، غالباً وہ امور مولانا موصوف کے پیش نظر نہ تھے، مولانا کئی نادر نسخوں کی ندرت کا ذکر نہیں کر سکے، نیز منحصر بالذات نسخوں کی طرف ان کی نظر نہیں گئی، پھر بے نظیر جلدوں والے

نسخے (جلد کی عمدگی کے اعتبار سے) ان کی توجہ کا مرکز نہیں بنے۔ جید علما سے نقل شدہ نسخے بھی کماحقہ توجہ نہ پا سکے، مولانا نے کئی نسخوں کے عنوانات، مصنّفین وشارحین کے اسماوغیرہ کا بے حد اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے، جس سے اصل عناوین اور اسماء میں ربط کی کمی سی ہوگئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی نقص نہیں بلکہ مولانا موصوف نے اپنے ماحول اور ضرورتوں کے پیش نظر یا اس وقت جس انداز سے فہارس تیار ہوتی تھیں ان کے مطابق کام کیا ہے۔

ذیل میں ہم اس ذخیرے کے کچھ اہم مخطوطات کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تا کہ ایک نظر میں اس کی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

۱۔ میرے خیال سے اس مجموعے کا قدیم ترین مخطوطہ نمبر ۱۶۲۱/ پر موجود ہے جو ہاتھ سے بنے ہوئے قدیم کاغذ پر لکھا گیا ہے۔ کتاب الاقناع: تالیف سعید بن ہبۃ اللہ بن الحسن (متوفی ۴۹۵ھ) کا یہ نسخہ اس کتاب کا صرف المقالۃ الرابعۃ ہے جو مصنف کی زندگی ہی میں ۴۸۱ھ میں نقل کیا گیا ہے۔ غالباً کاغذ پر یہ تحریر پاکستان میں سب سے قدیم ہے۔

۲۔ تیس سے زیادہ مخطوطات ایسے ہیں جو اس سے قبل کسی نہ کسی بادشاہ، وزیر یا اعیان حکومت میں سے کسی کے کتب خانے کی زینت رہے ہیں۔ ان میں ظہیر الدین بابر (۱۴۸۲ء۔۱۵۳۰ء)، سلطان مراد بن سلیم خان (۱۵۷۴ء)، جلال الدین محمد اکبر (۱۵۴۲ء۔۱۶۰۵ء)، عبدالرحیم خانخاناں (۱۵۵۶ء۔۱۶۲۷ء)، اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۱۸ء۔۱۷۰۷ء)، سلطان محمد الصفوی (قریباً ۱۷۱۹ء)، شاہ عالم محمد شاہ (قریباً ۱۷۸۸ء) اور تیمور شاہ (۱۷۵۷ء۔۱۷۷۳ء) کے کتب خانوں کے نشانات یا تحریریں ان کتابوں پر دکھائی دیتی ہیں۔ درج ذیل نمبروں پر واضح طور سے شاہی کتب خانوں کی مہریں یا نشانات نظر آتے ہیں:

۳۳، ۳۷، ۳۹، ۵۲، ۸۸ (ب)، ۹۸، ۱۶۵ (ب)، ۱۹۱، ۲۰۶، ۲۴۴، ۲۸۲، ۳۳۸، ۳۷۴، ۵۱۸، ۵۲۹، ۶۰۶، ۶۲۴، ۸۱۳، ۹۷۲، ۱۰۵۴، ۱۱۵۸، ۱۱۷۶، ۱۲۶۱، ۱۲۸۰، ۱۳۰۰ (الف)، ۱۴۰۲/۴، ۱۴۳۶، ۱۵۵۴ (ب)، ۱۶۲۶، ۱۷۵۲۔

کئی مخطوطات پر مٹی ہوئی مہروں کے نشان ہیں۔

۳۔ بہترین خطاطی کے ایسے نسخے جو بے مثل ہیں درج ذیل نمبروں پہ موجود ہیں:

۱۹۱،۱۹۱(ب)،۲۰۲،۲۸۰(د)،۱۹۳۱(ب)۔

۴۔کئی خطاطوں نے کتاب کے ابتدائی اور بعض اوقات درمیان میں بھی کئی صفحات بے حد خوبصورت، بے نظیر رنگوں کی مدد سے سرلوحہ بنائے ہیں۔ یہ انداز تجمیل اگرچہ قرآن کریم سے شروع ہوا مگر آہستہ آہستہ دیگر فنون کی کتب تک بھی پہنچ گیا۔درج ذیل نمبروں پر موجود مخطوطات میں اسی فن کا عروج دیکھا جاسکتا ہے:

۳۳،۳۸،۴۸،۸۴،۱۹۱،۲۱۲،۲۲۳،۶۰۰،۱۵۷۲،۱۶۰۹(الف)۔

۵۔کتابوں کو عروس جمیل کی طرح سجانا اور دیکھنا ثقافت اسلامی کا ایک امتیاز ہے،جلد سازی کی صنعت میں ایجاد و انفراد نے الگ الگ اسکول قائم کردیے۔اس کے بھی نمونے درج ذیل نمبروں میں دیکھے جاسکتے ہیں:

۲۶(ب)،۲۲۳،۴۴۱،۵۴۴،۵۴۸،۶۰۲،۱/ ۶۲۶،۱۹۳۱(ب)۔

مخطوطات کی قدر و قیمت اپنی جگہ لیکن بخط مصنف مخطوطہ کی شان سب سے الگ ہوتی ہے، درج ذیل مخطوطات کا شمار بھی اسی درجہ میں ہے:

المنہل البدیع فی مدح الملیح الشفیع،تالیف شعبان بن محمد الآثاری (متوفی ۸۲۸ھ) نمبر ۱۱۴۳۔

شرح مشکوٰۃ المصابیح،تالیف الحسین بن محمد بن عبداللہ الطیبی (متوفی ۷۴۳ھ) نمبر ۳۲۷۔

حاشیۃ علی شرح مختصر ابن حاجب للمعضدی محشی الشیخ عبدالحق بن سیف الدین المحدث الدہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) نمبر ۶۴۸،(یہ نسخہ حاشیہ نگار کے بیٹے نے اپنے باپ سے لیا ہے)۔

رسالۃ کلمۃ التوحید،تالیف اسماعیل بن مہرجان (متوفی ۱۲۳۹ھ)،نمبر ۸۲۶۔

شرح ابیات شرح الزنجانی،شارح شیر محمد بن شیخ محمد بن محمد شریف بن کمال الدین الفاروقی القرشی (متوفی؟) نمبر ۱۲۶۱/ ۲(ب وج)۔

البرہان المسلم بحرمۃ النداء باسمہ الاعظم،تالیف مولانا غلام جیلانی (متوفی ۱۲۹۲ھ) نمبر ۷۵۷۔

لباب الاخیار،تالیف صدر الدین بن محمد نعیم بن محمد عظیم البشاوری البنجابی، نمبر ۱۹۴۵/ ۱۔

میزان اللسان،تالیف مولانا عبدالرحیم (متوفی ۱۳۶۹ھ) نمبر ۲۵۳۵۔

۶۔مندرجہ ذیل نسخے صرف اور صرف اسی کتب خانہ میں ہیں:

عدۃ المسافر وعدۃ الحجاج والزائر، تالیف عبداللہ بن احمد بن عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد المقدادی الحضرمی (متوفیٰ ۱۲۶۶ھ) نمبر ۶۰۸۔ یہ نسخہ ۱۲۳۹ھ یعنی حیات مؤلف میں نقل ہوا ہے، گمان یہ ہے کہ مولف کے ہاتھ کا ہے۔

الصلاۃ الطاہرۃ، تالیف نعمۃ اللہ بن طاہر بن محمود بن طاہر النہروانی، نمبر ۶۹۰، (بروکلمان، ذیل ۲/۱۰۱۰)۔

عجائب الاشعار وغرائب الاخبار، تالیف مسلم بن محمود بن نعمۃ بن رسلان ابوالغنائم الشیزری (متوفیٰ ۶۲۶ھ) نمبر ۱۱۰۰۔

مفاتیح الرحمۃ واسرار الحکمۃ، تالیف مؤیدالدین الحسنین بن علی بن محمد الطغرائی (متوفیٰ ۵۱۵ھ) نمبر ۲/۱۶۳۲/۱۔

۳۔ مندرجہ ذیل خطاط بجائے خود نامور علما میں تھے:

ابوسعید شعبان بن محمد القرشی، نمبر ۱۱۴۳۔ ابن محمد الحسنی المتوفیٰ، نمبر ۱۲۹۶۔ احمد بن محمد بن عمران المقدسی، نمبر ۱۸۱۴۔ احمد بن علی العطیوی الشعراوی، نمبر ۸۹۱۔ احمد بن محمد بن بنہان، نمبر ۱۶۲۱۔ الایہاب بن محمد بن محمد بن الشیخ محمد العولتی المعری، نمبر ۱۳۰۱۔ جمیل بن جلال بن جمیل الدین الاخسیکثی، نمبر ۶۷۲۔ حاشوک الکرکی الشافعی علی بن احمد بن علی بن ابی بکر بن حاشوک، نمبر ۷۴۵۔ الحانوتی الحنفی، محمد بن عمر، صاحب الفتاویٰ الحانوتیہ، نمبر ۳۱۲۔ حسین بن خواجہ سیف الدین بن خواجہ نظام، نمبر ۲۲۷۔ سلیمان بن محمد الامین الصبرانی، نمبر ۵۳ (الف)۔ شیر محمد بن شیخ محمد بن محمد شریف بن کمال الدین القرشی الفاروقی، نمبر ۱۲۶۱/۲ (ب وج)۔ صدر الدین بن محمد نعیم بن محمد عظیم البشاروی البنجابی، نمبر ۱۹۴۵/۱۔ الطیبی حسین بن عبداللہ بن محمد، نمبر ۳۲۷۔ عبدالجلیل بن عبداللہ الدمیری، نمبر ۶۲۴/۲۔ عبدالحق بن سیف الدین الدہلوی الشیخ المحدث، نمبر ۶۴۸۔ عبدالرحمٰن الاشمونی، نمبر ۱۸۱۔ عبدالعزیز بن یوسف بن عبدالغفار بن عبدالوہاب بن محمد بن عبدالصمد السنباطی، المعروف بالمنہجی، نمبر ۲۲۳۔ علی بن محمد الجبرتی، الفقیہ، نمبر ۷۸۴۔ علامہ غلام جیلانی، صاحب الخزانہ، ۱۴ر مخطوطات سے زیادہ۔ علامہ غلام حبیب، والد صاحب الخزانہ، ۱۷ر مخطوطات سے زیادہ۔ علامہ غلام مصطفیٰ، صاحب الخزانہ، ۶ر مخطوطات سے زیادہ۔ لطف اللہ المہندس بن الاستاذ احمد المعمار اللاہوری، نمبر ۱۰۹۳۔ محمد بن ابی بکر

بن محمد بن الابق الشافعی،نمبر۶۱۲۔محمد میاں ملا بن محمد غوث ملا بن محمد سلیم بشاروی،نمبر۲۴۰، ۷۸۷(الف)۔ محمد بن حسن بن علی بن محمود ملک الجہرمی الایجی،نمبر۸۱۳۔محمد بن زین الدین بن علی البرکی السامی ، نمبر۸۷۷/ج(ا)۔محمد بن عبیداللہ بن محمد البسیونی الشافعی،نمبر۶۵۰۔محمد بن علی الامام الہدی،۷ر مخطوطات کے قریب۔محمد بن علی بن حسین بن نعمۃ بن......بن خاتون،نمبر۵۴۵۔محمد مبارک الغیاثی الہروی،نمبر۹۴۸/۳،۲۔محمود بن سعود بن محمود المتطیب،نمبر۱۶۸۳۔مصطفیٰ بن احمد بن حجازی المقری الحنفی،نمبر۱۸۴۔موسیٰ بن محمود بن یعقوب بن بیرم شاہ بن حاجی محمد ترخانی منقشلاقی،نمبر۲۸۷۔نور محمد بن الشیخ جیون،نمبر۴۹۷۔وحید الدین بن الحافظ محمد غوث القادری،نمبر۴۸۳۔یوسف بن عبدالواحد الحسینی،نمبر۱(الف)۔یونس بن مکی بن یونس الحافظ،نمبر۱۰۸۲۔

خیال ہے کہ ایسے کتنے خزانے برصغیر میں ہوں گے مگر بدقسمتی سے وہ معلوم ومتعارف نہیں۔ ضرورت ہے کہ ایسے قیمتی جواہر پاروں کی فہارس مرتب کی جائیں تا کہ ان سے کماحقہ استفادہ ہو سکے۔

مراجع وحواشی

(۱) غلام جیلانی بن غلام حبیب بن غلام مصطفیٰ بن محمد معظم بن محمد علی ۔ یہاں تک ان کا شجرۂ نسب معلوم ہے۔ عام طور پر لوگ صرف غلام جیلانی بن غلام حبیب ہی جانتے ہیں۔میں نے ایک کتاب ’’ترکیب مائۃ عامل (نمبر۱۲۶۵/۳/۲) جو غلام مصطفیٰ بن محمد معظم بن محمد علی کی نقل کردہ ہے،اس کے شروع میں لکھا پایا: غلام مصطفیٰ جدامجد غلام جیلانی، علاوہ بریں نمبر۵۵۳، ۱۳۴۴ر اور ۱۳۴۸ر پر موجود خطی کتابوں میں بھی، جو غلام مصطفیٰ کے ہاتھ کی تحریر ہیں، یہی نسب نامہ درج ہے۔(۲) صرف میر (فارسی) نمبر۱۳۳۹/۲، غلام مصطفیٰ نے ۱۱۱۱ھ میں اپنے مطالعہ کے لیے نقل کی ہے۔(۳) خدابخش لائبریری جرنل۔۶ میں خدابخش کا اپنا انگریزی مضمون Islamic Libraries، ص۱۴ر ملاحظہ ہو، جس میں انہوں نے خدابخش لائبریری میں مخطوطات جمع کرنے کے سلسلے میں اپنے خاندان کی خدمات بیان کی ہیں۔(۴) اس خاندان کے اکثر افراد نے جید علما سے اکتساب علم کیا ہے۔ آخری فاضل غلام جیلانی، حبیب اللہ قندھاری کے شاگرد رشید تھے۔مولانا عبدالرحیم افغانی سے بھی انہوں نے کسب فیض کیا اور ذہنی تربیت حاصل کی۔

زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ایسے علمی خانوادہ کے کچھ احوال صرف آخری عالم غلام جیلانی کے بتائے

جاتے ہیں۔باقی سب حضرات کے بارے میں تذکرہ نگار بالکل خاموش ہیں۔تاہم کوئی صاحب اس ذخیرے کے مخطوطات، خاص طور پر فارسی مخطوطات کو پوری دقت نظر سے ملاحظہ کریں تو دیگر اصحاب خاندان کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں۔

مولانا غلام جیلانی کے حالات ان دو تذکروں میں موجود ہیں:

شخصیات سرحد، ازمحمد شفیع صابر، پشاور، یونیورسٹی بک ڈپو، ت-ن،ص ۱۷۵-۱۷۶۔

تذکرہ علماو مشائخ سرحد، ازمحمد امیر شاہ گیلانی، ۱۹۶۴ء و ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۳-۱۲۱۔

(۵)اس ضمن میں مولانا مرحوم کے سفرنامے میں یادداشتیں موجود ہیں جو اس کتب خانے میں نمبر ۵۵۹ پر موجود ہے۔ (۶)لباب المعارف العلمیة فی مکتبة دار العلوم الاسلامیة ،ص ۳۔(۷) Islamic college and collegiate school, Peshawar, Golden Jubilee, 1913-1963, Peshawar: Ferozsons Limited, 1963,P-12. (۸)انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس خاندان کی ان بے نظیر خدمات کے اعتراف میں بلکہ اس احسان کے بدلے میں اس ذخیرے کا عنوان اصل خدمت گزار کے نام رکھا جائے۔ کارپردازان اسلامیہ کالج پشاور سے میری درخواست ہے کہ کالج کی لائبریری میں کم ازکم اس مجموعہ مخطوطات کا نام اردو میں ''ذخیرۂ غلام جیلانی'' اور انگریزی میں Ghulam Jilani Collection رکھیں۔مخطوطات کی نئی جلد بندی کروائی جائے اور ان کے نمبر اس کے بعد لگائے جائیں یعنی اس کی Renumbering کی جائے۔ اس طرح یقیناً مخطوطات کی صحیح تعداد کا پتہ چلے گا جو بلاشبہ مولانا عبدالرحیم کی تیارکردہ فہرست سے زیادہ ہے۔ (۹)مطبوعہ شام لال اینڈ سنز، پرنٹرز پشاور (اینڈ پنجاب فرنٹیر پریس) کی طرف سے ۱۰/اپریل ۱۹۱۶ء کو ٹائپ صورت میں ۱۳/صفحات علاوہ کور چھپے۔(۱۰)ان زائرین میں حکیم محمد اجمل، منوہر لال پرنسپل گورڈن کالج راولپنڈی، اے-سی-ولنر (A.C.Woolner) پنجاب یونیورسٹی لاہور، ای-پی-ہارڈی (E.P.Hardy) یونیورسٹی آف درہم (Durham)، جناب عبدالمعید ناظم مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن، محمد علی جناح، محمد رضا شاہ پہلوی، احمد زکی مدیر مجلس فؤاد اول الاعلی للبحوث بالقاہرہ، عبدالوہاب عزام، عمر بہاء الدین الامیری، ڈاکٹر محمد سویسی (تونس) کے علاوہ کئی مقتدر علمی وسیاسی ہستیاں ہیں۔مکمل فہرست کتب خانے کی وزیٹر بک میں دیکھی جاسکتی ہے۔(۱۱) فہرست مکتبہ علوم شرقیہ، دارالعلوم اسلامیہ، پشاور صوبہ، سرحد (شعبۂ اردو کتب) پشاور، اقبال پریس میں باہتمام سید ایوب شاہ منیجر چھپی، ۱۹۲۸ء، ۴۸ صفحات۔(۱۲)الف: درج ذیل حضرات بعض مخطوطات کو پی ایچ ڈی کے لیے

ایڈٹ کر چکے ہیں:

قاضی محمد مبارک: الکوکب الدری، تالیف عبدالرحیم الاسنوی، نمبر ۶۱۳۔جمیل الرحمٰن: العباب شرح اللباب فی علم الاعراب، تالیف الاسفرائنی، شارح نقرہ کار، نمبر ۱۲۵۳ (نصف اول)۔انوارالحق: العباب شرح اللباب فی علم الاعراب، تالیف الاسفرائنی، شارح نقرہ کار، نمبر۱۲۵۳ (نصف ثانی)۔نیاز محمد: کفایۃ المفرطین (شرح الشافیۃ) تالیف محمد طاہر بن علی الفتنی، نمبر ۱۲۸۰۔ایک شامی طالب علم: عجائب الاشعار وغرائب الاخبار، تالیف الشیزری، نمبر۱۱۵۵۔

ب: درج ذیل حضرات نے اس کتب خانے میں موجود مخطوطات پر ایم فل کیا ہے:

سید روحانی: شرح ملا علی قاری علی الفقہ الاکبر، للامام الاعظم، نمبر ۱۹۹۶۔محمد شفیق: نیل المراد فی تخمیس بانت سعاد از الآثاری، نمبر۱۱۴۳۔(۱۳) یہ خیال رہے کہ جب بروکلمان نے اپنی کتاب مرتب کی تو مولانا مرحوم کی فہرست ان کے سامنے تھی۔کیوں کہ اس فہرست کے بعد کئی مخطوطات اس ذخیرے میں آئے نیز یہ کہ اس فہرست میں بیسیوں ایسے مجموعہ ہائے مخطوطات تھے جن کے صرف پہلے نسخے کا عنوان درج تھا، جب کہ باقی کتب و رسائل بغیر درج رہ گئے تھے۔علاوہ بریں علامہ کی فہرست اردو میں ہونے کی وجہ سے اس کا دائرۂ استفادہ اتنا وسیع نہ تھا جتنا کہ یہ ذخیرہ طالب ہے یا حق رکھتا ہے، کئی حضرات نے زبانی اس امر کی طرف کارپردازان کالج کی توجہ دلائی کہ مخطوطات کی جدید اور وسیع پیمانے پر معروف زبان میں فہرست بنائی جائے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ڈاکٹر محمد سویسی (تونس) نے ۱۹۷۳ء میں اس ذخیرے کے معائنے کے بعد بڑی خوبصورت رائے دی۔(۱۴) جید عالم و فاضل تھے۔مرحوم آخری ایام میں فیڈرل شریعت کورٹ (اسلام آباد) کے جج بھی رہے۔ان کی زندگی کے احوال کے لیے دیکھیے: شخصیات سرحد از محمد شفیع صابر، ص ۲۵۳ و مابعد و مقالہ مولانا عبدالقدوس قاسمی از عالم زیب۔(۱۵) اس کتب خانے کے لائبریرین جناب عبدالحمید صاحب نے ۱۹۹۹ء میں ایم فل کی تکمیل کے طور پر اس کتب خانے کے جملہ مخطوطات کی ایک پروفارمے کی مدد سے فہرست بنائی جس میں بقول ان کے مولانا عبدالرحیم صاحب کی فہرست میں انہی کی تصحیحات کا اضافہ بھی کیا گیا۔لیکن اس میں بوجہ کمپیوٹر بہت سی غلطیاں در آئیں۔

اردو شارٹ ہینڈ اور علامہ شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی سیرت و شخصیت اور کارناموں میں بڑا تنوع ہے۔ ۱۹۴۳ء میں ضخیم ''حیات شبلی'' کی اشاعت کے بعد بھی اس میں گاہے ماہے اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ماہنامہ معارف اور بعض دوسرے رسائل میں اس نوع کی متعدد تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ گذشتہ دنوں حیات شبلی کا ایک اور ورق دریافت ہوا۔ ۲۷ مارچ ۱۹۱۲ء کو کرسچین کالج لکھنؤ میں اردو شارٹ ہینڈ کلاس کے طلبہ کا تیسرا سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں علامہ شبلی نعمانی بھی شریک ہوئے تھے اور نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی تھی۔ اس جلسہ کی صدارت انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر ولسن ایم سٹریٹ (Willson M. Strait) نے کی تھی۔ پروفیسر ایم ایل گھوش جنھیں اردو شارٹ ہینڈ کا بانی خیال کیا جاتا ہے، اجلاس کے روح رواں تھے، انھوں نے اردو شارٹ ہینڈ کے موضوع پر تقریر کی۔ پروفیسر ایم ایس برانچ نے منیجر کی حیثیت سے رپورٹ پیش کی۔ مرزا ہادی رسوا (۱۸۵۷-۱۹۳۱ء) بھی شریک جلسہ تھے، اس موقع پر شارٹ ہینڈ طلبہ نے اپنی فنی دلچسپی کا مظاہرہ پیش کرتے ہوئے مقررین کی تقریریں شارٹ ہینڈ کے ذریعہ محفوظ کیں اور پھر پڑھ کر سنائیں، اجلاس کی رپورٹ کے ساتھ تقریر کے دو اقتباسات ۱۷/اپریل ۱۹۱۲ء کے زمیندار لاہور میں نقل ہوئے ہیں۔ پہلا اقتباس مسٹر ولسن ایم سٹریٹ کا ہے۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:

> ''فن شارٹ ہینڈ عملی دنیا کی مشین کا ایک ضروری پرزہ بنتا جارہا ہے اور امور سیاست اور دیگر معاملات دنیاوی کی انجام دہی کے لیے بہت ہی مفید اور کارآمد ہے اور میں بہت خوش ہوں کہ ہماری گورنمنٹ نے اس طریقہ شارٹ ہینڈ کو پسند کیا ہے۔

رفیق اعزازی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ E-mail: azmi408@gmail.com

آپ حضرات مجھ سے اتفاق کریں گے کہ جو آزمائش اس فن کی آج ہم سب کے سامنے کی گئی وہ قابل اطمینان ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مولانا شبلی بھی اقرار کریں گے، گوان کی تقریر نہایت فصیح تھی لیکن طلبائے شارٹ ہینڈ نے اس کو بہت ہوشیاری سے قلم بند کیا اور نہایت خوبی سے پڑھ کر سنایا''۔ (زمیندار لاہور، ۱۷/اپریل ۱۹۱۲ء)

دوسرا اقتباس علامہ شبلی کی تقریر کا ہے جو اس لحاظ سے بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ''اردو شارٹ ہینڈ'' کے منفرد موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اور جس کا ان کی سوانح میں کہیں ذکر نہیں ملتا، علامہ شبلی کے ملکہ خطابت اور ''خطبات شبلی'' پر متعدد تحریریں شائع ہوئی ہیں مگر ان میں بھی خطبہ اور جلسہ میں شرکت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں:

''اگر چہ یہ (شارٹ ہینڈ) ہر زمانہ میں نہایت مفید و فائدہ رساں ہے لیکن آج کل کے زمانہ میں جو کہ یورپ کی تہذیب اور تمدن کا زمانہ ہے، یہ فن صرف فائدہ رساں ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے اور بغیر اس کے آج کل کی تہذیب و تمدن کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ چونکہ ہر قسم کے خیالات کے اظہار و ترقی و اشاعت کا دارو مدار ہے فن تقریر پر اور تقریروں سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو کہ وہاں موجود ہوتے ہیں اس لیے مقرروں کے خیالات سے تمام پبلک کو فائدہ پہنچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی تقریر قلم بند کی جائے اور اس مقصد کو شارٹ ہینڈ ہی پورا کر سکتا ہے، اس لیے وہ بے انتہا مفید ہے۔ پس ہندوستان کی تاریخ میں شارٹ ہینڈ کا قائم مقام ہونا اردو کا ایک خاص نیا باب ہے۔ میری تقریر جو کہ میں نے طبی کانفرنس میں کی تھی، اس فن کے ماہرین نے قلم بند کیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ میری تقریر اور (شارٹ ہینڈ) میں بہت ہی کم فرق تھا۔ علاوہ پولیس کے لوگوں کے اور لوگ مثلاً اخبار کے رپورٹر اور ارباب قلم اگر اس فن کو سیکھنا چاہیں تو انہیں موقع دیا جانا چاہیے اور کوئی فیس مقرر ہونی چاہیے گو وہ بہت گراں ہو۔ اس کامیابی پر میں تمام طلبا کو اور مسٹر گھوش جو اس فن کے بانی ہیں اور اپنے معزز دوست مرزا ہادی صاحب اور پریزیڈنٹ صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں''۔ (زمیندار لاہور، ۱۷/اپریل ۱۹۱۲ء)

اس خطبہ سے اردو شارٹ ہینڈ کی افادیت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کسی طبی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اور اس موقع پر انہوں نے جو تقریر کی تھی اسے شارٹ ہینڈ والوں نے نقل کیا تھا مگر جہاں تک مجھے علم ہے اس تقریر کا ذخیرۂ شبلیات میں کہیں ذکر نہیں ہے۔

اسی طرح علامہ شبلی لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے بعض اجلاسوں میں شریک ہوئے اور خطاب بھی کیا مگر وہ خطبات بھی اب تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ بہر حال مذکورہ خطبہ ذخیرۂ شبلیات میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تفصیل لاہور سے ہمارے کرم فرما جناب احمد سعید صاحب نے بھیجی ہے۔ اس التفات کے لیے ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔

علامہ شبلیؒ کے متعلق دو عربی تحریریں

ڈاکٹر ابوذر متین

علامہ شبلی کے مقام و مرتبہ اور ان کی خدمات کے اعتراف میں دو نادر عربی تحریریں اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ایک تحریر تو بطور خبر چھپی تھی۔دوسری تحریر ایک مدحیہ عربی قصیدہ ہے، جو عبدالمجید حیدر آبادی کا نتیجۂ فکر ہے۔یہ دونوں تحریریں عبداللہ عمادی (۱۸۷۹-۱۹۴۷ء) کے زیر ادارت لکھنؤ سے شائع ہونے والے عربی ماہنامہ مجلہ ''البیان'' چھپی تھیں، خاکسار کے مطالعہ میں یہ کہیں اور نظر سے نہیں گزریں، اسی لیے ان کو نادر کہنے کا جواز مل گیا۔

مجلہ ''البیان'' کی خبر اس طرح ہے:

''عين فضيلة الأستاذ العلامة شبلي النعماني رئيس شرف للنادي الإسلامي الأدنبرجے في إسكاتليند، ومن مشاهير المسلمين الذين شرفوا النادي برياستهم قبل فضيلته حضرة المفضال السيد أمير علي قاضي قضاة الهند سابقاً، وصاحب السعادة محمد فريد بك المصري، والشيخ عبد الله كويليام۔''(۱)

ترجمہ: فضیلۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی اسکاٹ لینڈ کی ایڈنبرا اسلامی سوسائٹی کے آنریری صدر منتخب کیے گئے ہیں، ان سے قبل مسلمانوں کی جن مشہور شخصیات نے اس سوسائٹی کے عہدہ صدارت کو عزت بخشی ہے۔ان میں ہندوستان کے سابق جسٹس آنریبل سید امیر علی، عزت مآب محمد فرید بک مصری اور جناب عبداللہ کویلیم ہیں۔

یہاں علامہ شبلی کے علاوہ جن تین حضرات کا ذکر ہے ان میں سید امیر علی اور فرید بک مصری سے

ڈاکٹر ابوذر متین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ ۲۰۲۰۰۲۔

اہل علم بخوبی واقف ہیں۔اناؤ یوپی میں (۱۸۴۹-۱۹۲۸ء) پیدا ہونے والے سید امیر علی نے آخر عمر میں اپنی انگریز بیوی کے ساتھ لندن میں سکونت اختیار کرلی تھی،ان کی علمی خدمات میں صرف اسپرٹ آف اسلام ہی ان کی عظمت کے لیے کافی ہے۔مشہور مصری مصنف احمد امین نے عہد حاضر کے مصلحین امت میں سرسید کے ساتھ امیر علی کا نام بھی شمار کیا ہے۔

محمد فرید ترکی الاصل تھے مگر پیدائش،تعلیم وتربیت سب قاہرہ میں ہوئی،سید امیر علی کی طرح ان کا بھی خاص مضمون قانون تھا،مصر کی آزادی کے لیے استعمار سے برسرپیکار رہے۔برلن میں وفات پائی اور مصر میں تدفین ہوئی (۱۸۶۸-۱۹۱۹ء) کئی بیش قیمت کتابیں جیسے تاریخ الدولۃ العلیا اور من مصر الی مصر وغیرہ یادگار ہیں۔

تیسری شخصیت عبداللہ کویلیم (۱۸۵۶-۱۹۳۲ء) کی ہے،برطانوی مستشرق تھے۔قانون ان کا بھی موضوع تھا ۱۸۸۷ء میں اسلام قبول کیا،عبداللہ نام رکھا اور اپنے ہی ملک میں گویا اسلام کے سفیر بن گئے۔برطانیہ میں پہلی مسجد تعمیر کرانے والے کہے جاتے ہیں،ان کی ایک کتاب میں اسلام قبول کرنے کے اسباب کے ساتھ مخالفین کے اعتراضات کے جواب بھی ہیں۔عربی میں یہ کتاب احسن الاجوبہ کے نام سے مقبول ہوئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس عربی خبر کی جانب ایک اشارہ مشرف الحق نامی ایک مکتوب نگار کے خط میں ملتا ہے جو علامہ شبلی کے نام ہے،یہ خط کتاب علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط،مرتبہ ڈاکٹر الیاس الاعظمی میں موجود ہے۔

عبدالمجید حیدرآبادی کا یہ عربی قصیدہ بیس اشعار پر مشتمل ہے،افسوس کہ عبدالمجید حیدرآبادی کے متعلق اب تک معلومات دستیاب نہیں،شاید اس تحریر سے کوئی پتہ چل سکے۔یہ قصیدہ ۱۹۰۸ء کا ہے،علامہ کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا،عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے عرض کرسکتا ہوں کہ اشعار فنی لحاظ سے بلند درجہ نہیں،کہیں کہیں طباعت کی غلطیاں بھی ہیں۔شاعر کا ذکر حضرۃ الفاضل سے کیا گیا ہے۔اشعار درج ذیل ہیں،اردو ترجمہ وترجمانی میری زبانی ہے:

۱۔ شمس العلی بزغت علی الامصار فأضاءت الآفاق بالأنوار

(بلندی کا سورج دنیا میں طلوع ہوا تو اس نے پوری کائنات کو اپنی روشنی سے منور کردیا۔)

۲۔ جلت الصدور بشرقها و تألقت وصفت بطلعتها عن الاکدار

(اس نے اپنی روشنی سے دلوں کو چمکا دیا اور روشن کردیا اور اس نے اپنی آمد سے آلودگی ختم کردیا۔)

۳۔ سمح أريبٌ جهبذ وحلاحل يجد واندادہ بوابل مدرار
(آپ سخی، ماہر، دانا اور بہادر ہیں تخلیق کار ہیں اور ان کی مثال برسنے والے بادل جیسی ہے۔)

۴۔ حبر نبیل راسخ فی قوله فرد الزمان وأوحد الأعصار
(عالم وفاضل ہیں اپنے قول کے پختہ ہیں یکتائے زمانہ ہیں اور زمانے کے لیے نایاب ہیں۔)

۵۔ مولائی شبلی الأنام ومن هو الشهم الخبیر بغامض الأسرار
(میرے کرم فرما شبلی زود فہم انسان ہیں جو پیچیدگی کے مسائل سے واقف ہیں۔)

۶۔ من فاق غر مجامع أدبیته من منطق وفصاحة الأشعار
(جو اپنی ادبی زبان اور اشعار کی فصاحت کی بدولت اکیڈمیوں کی شان ہیں۔)

۷۔ فذ لبیب مصطع و سمیدع ببلاغة و براعة التذكار
(آپ اپنی فصاحت وبلاغت اور ندرت خیال کی وجہ سے فصیح وبلیغ اور صاحبِ فہم ہیں۔)

۸۔ تاج الأكابر مفخر لذوی النهی بدر الحجی(۶) بسواطع الأفكار
(سرداروں کے سردار ہیں اہل خرد کے نزدیک قابل تعظیم ہیں عمدہ افکار کی بدولت ماہ کامل ہیں۔)

۹۔ نجم الذكاء به السرائر انجلت وتبلجت كطوالع الاقمار
(ذکاوت کے ایک ستارہ ہیں ان کے ذریعہ سربستہ راز کھل گئے اور وہ راز چاند کی روشنی کی طرح ظاہر ہوگئے۔)

۱۰۔ بحر العلوم تلاطمت أمواجه عین الفنون مفیضة الأنهار
(علوم کے سمندر ہیں فنون کے سرچشمہ ہیں جن کی موجیں فیض رساں اور تلاطم خیز ہیں۔)

۱۱۔ روض المحاسن أینعت أثماره وثغوره (۷) تفترك (۸) الازهار
(اچھائیوں کے گلستان ہیں جس کے پھل پکے ہوئے اور اس کے پھول خوشبو بکھیرنے والے ہیں۔)

۱۲۔ نجل الأفاضل خیر كل سلالة قرم الأفاخم صفوة الاخیار
(شرفاء کی اولاد ہیں خاندانوں میں برتر ہیں صاحب حیثیت ہیں چنندہ ہیں۔)

۱۳۔ صدر الكرام شرافة ونجابة فخر العظام و أسوة الابرار
(شرافت و بزرگی کے اعتبار سے ارباب ذی وقار کے امام ہیں قابل فخر ہیں اور نیکوکاروں کے لیے عمدہ نمونہ ہیں۔)

۱۴۔ وهو الكریم المجتبی اكرم به غیث السماحة معتلی المقدار

(آپ محبوب ومکرم ہیں، آپ کو کیا خوب انعام واکرام سے نوازا گیا۔)

۱۵۔ والیکمو دامت علاکم ینتھی بذل المکارم فی الزمان انصاری(۹)

(آپ قدرومنزلت کے اعلیٰ مقام پر ہیں، آپ پر زمانہ کی تمام بلندیاں ختم ہوتی ہیں۔)

۱۶۔ انتم ذو امل ومن ذا یرتجی غیر الجناب بھذہ الاقطار

(آپ امید کی آماجگاہ ہیں اب آپ کے علاوہ کس سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔)

۱۷۔ یدعو لرفعة جاھکم و جلالکم عبد المجید برائق الاشعار

(عبدالمجید اپنے اشعار کے ذریعہ آپ کی عظمت وشان کے لیے دعا گو ہے۔)

۱۸۔ فافاض فیضکم الا له بفضله ما لاح برق فی الغمام الساری

(اللہ تعالیٰ آپ پر اپنے فضل وکرم کا معاملہ کرے جس میں کوئی کمی حائل نہ ہو۔)

۱۹۔ وادام عزمکو بجاہ حبیبه خیر الانام وآله الأطهار

(اللہ تعالیٰ اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل آپ کے مرتبہ کو بلند وبالا کرے جو بنی نوع انسان میں اعلیٰ صفات اور برگزیدہ ہیں۔)

۲۰۔ صلی علیه وآله رب الوری ما غنت الورقاء فی الأشجار (۱۰)

(رب کائنات نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب کی تعریف کی ہے، جس طرح فاختہ درختوں پر نغمہ سنج رہتی ہے۔)

(اگست ۱۹۰۸ء حیدرآباد)

مراجع وحواشی

(۱) مجلۃ ''البیان'' المدیر عبداللہ العمادی، ادارۃ البیان، بلکناؤ، الھند، شہر رمضان المبارک سنۃ ۱۳۲۶ھ، جلد: ۷، العدد: ۶، ص ۲۔ (۲) الأعلام۔ خیرالدین الزرکلی، الجزء الثانی، دارالعلم للملایین، بیروت، لبنان، الطبعۃ السابعۃ عشرۃ، اغسطس، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۔۱۴۔ (۳) الأعلام۔ خیرالدین الزرکلی، الجزء السادس، دارالعلم للملایین، بیروت، لبنان، الطبعۃ السابعۃ عشرۃ، اغسطس، ۲۰۰۷ء، ص ۳۲۸۔۳۲۹۔ (۴) الأعلام۔ خیرالدین الزرکلی، الجزء الرابع، دارالعلم للملایین، بیروت، لبنان، الطبعۃ السابعۃ عشرۃ، اغسطس، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۵۔ (۵) علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، مصنف ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ناشر، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، طبع اول، جولائی ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۰۔۱۳۱۔ (۶) الدجی ہونا چاہیے۔ (۷) زھورہ ہونا چاہیے۔ (۸) تفرک ہونا چاہیے۔ (۹) السار ہونا چاہیے۔ (۱۰) مجلۃ ''البیان'' لکناؤ، شعبان المعظم ۱۳۲۶ھ جلد: ۷، العدد: ۵، ص: ۲۲۔۲۳۔

اخبار علمیہ

''پہلی آن لائن عربی شعری انسائیکلو پیڈیا''

گذشتہ دنوں مکہ کے گورنر خالدالفیصل نے جدہ میں مرکزی دفتر سے پہلی آن لائن عربی شعری انسائیکلوپیڈیا کا افتتاح کیا۔ یہ ام القریٰ یونیورسٹی کا منصوبہ تھا۔اس کا مقصد عربی زبان وادب کے لیے معتبر ماخذ اور ایک مضبوط و پائیدار تحقیقی انجن فراہم کرنا ہے جس کا خاکہ یونیورسٹی کے انجینئرنگ مرکز تحقیق نے تیار کیا ہے۔اس منصوبہ کا مختصراً تذکرہ کرتے ہوئے گورنر نے بتایا کہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مرکز تحقیق عربی زبان کے ۶۷ محققین نے حصہ لیا ہے۔ یہ انسائیکلو پیڈیا اسلام کے ابتدائی عہد کے ۳۴۰۰ شعرا کے متعلق معلومات پر مشتمل ہے نیز یہ ان محققین کی بھی مدد کرے گی جن کو عربی شاعری کے فنی، لسانی، لغوی اور صوتی مطالعات سے دلچسپی ہے۔(ینگ مسلم ڈائجسٹ (انگریزی) بنگلور، جنوری ۲۰۲۰ء، ص ۴۲)

''کرونا کے خاتمہ سے متعلق حدیث نبویؐ سے غلط استدلال''

کرونا وائرس کے قہر سے پوری دنیا میں لاکھوں انسان متاثر اور اب تک پونے دولاکھ کے قریب افراد لقمۂ اجل ہو چکے ہیں۔طبی سائنس کی ہوش ربا ترقی اس غیر مرئی اور انتہائی نازک جرثومہ کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔فی الحال اس سے نجات کی صورت گھروں میں رہنا ہے۔اسی دوران سماجی ذرائع ابلاغ پر بعض علما کی جانب سے ''اذا طلع النجم ذا صباح رفعت العاهة'' (مسند احمد: ۸۴۹۵) یعنی جب صبح کے وقت ثریا طلوع ہو تو آفت ختم ہوجائے گی اور اسی مفہوم کی دوسری احادیث پیش کرکے عوام الناس کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ۱۲ رمئی کو ثریا کے طلوع ہوتے ہی اس عالمگیر وبا سے دنیا کو نجات مل جائے گی (خدا کرے ایسا ہوجائے) لیکن جب ایک عالم ڈاکٹر غلام زرقانی صاحب نے اس سلسلہ کی احادیث اور اس کے پس منظر کا جائزہ لیا تو ان کے بیان کے مطابق یہ سب ایک ہی حقیقت کو الگ الگ زاویے سے بیان کررہی ہیں۔ان کی یہ تحریر روزنامہ انقلاب میں شائع

ہوئی ہے، یہاں اسی مضمون کے ضروری حصہ کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ایک روایت میں ہے کہ کسی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پھلوں کے خریدنے کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت تک پھلوں کے خریدنے سے منع کیا ہے جب تک کہ وہ مضرت سے محفوظ نہ ہوجائیں، پوچھا گیا مضرت کب ختم ہوگی تو فرمایا کہ جب ثریا طلوع ہوجائے (مسند احمد: ۵۰۱۲)۔اسی طرح ایک حدیث ''اذا طلع النجم ذا صباح رفعت العاھۃ عن اھل کل بلد ''یعنی جب ثریا طلوع ہوجائے تو ہر ملک سے مصیبت ختم ہوجائے گی، کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ اس میں ہر شہر سے مضرت کے خاتمہ کی بات ہے لیکن یہ صاف نہیں ہے کہ کس طرح کی مضرت؟ آگے لکھتے ہیں کہ ماہرین کے مطابق ثریا مئی کے پہلے عشرے میں نمودار اور اکتوبر،نومبر کے آخری عشرے میں چھپ جاتا ہے اور یہ ثریا کا طے شدہ سالانہ عمل ہے،لہٰذا اس سے یہ سمجھنا قطعاً غلط ہے کہ ان احادیث میں کرونا وائرس کے خاتمہ کے متعلق کوئی پیشین گوئی ہے۔ایک خاص پس منظر میں دی گئی ہدایت مصطفیٰؐ کو وسعت دیتے ہوئے موجودہ عہد میں پھیلی ہوئی اس وبا سے منسلک کردینا قطعی نامناسب اور اپنی مرضی کے مطابق حدیث نبویؐ کی معنوی تحریف کا ارتکاب ہے جو نہایت خطرناک گناہ ہے۔مقالہ نگار نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اگر اس کا علم غیروں کو ہوگیا اور خدانخواستہ ۱۲؍مئی تک یہ وبا ختم نہ ہوئی تو براہ راست آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم پر ان کو انگشت نمائی کا موقع مل جائے گا۔اسی کے ساتھ ساتھ بعید نہیں کہ ضعیف الایمان مسلمان بھی حدیثوں اور دینی سرمایہ کے متعلق خواہ مخواہ شکوک وشبہات میں پڑجائیں۔

''ماحولیاتی شعور اجاگر کرنے والا فن پارہ''

لاطینی امریکہ سے تعلق رکھنے والے ۲۳ سالہ آسکر اولیوار یز نے بوتل کے دولاکھ رنگ برنگے ڈھکنوں سے ماحولیاتی شعور اجاگر کرنے والا فن پارہ تیار کیا ہے۔یہ خوبصورت فن پارہ پلاسٹر سے چپکا کر بنایا گیا ہے۔جو مجموعی طور پر ۴۵ میٹر طویل ہے۔اس کی تیاری پر ڈھائی ماہ کا عرصہ صرف ہوا ہے۔ جس دیوار پر یہ فن پارہ بنایا گیا ہے وہ ایسکالونا کے قریب واقع ہے جو شہر کاراکاس میں موجود ہے۔

دیوار کی لمبائی ۵۴ میٹر ہے۔ مستقبل کی تعمیرات کی تحریک کے تحت ویز ویلا میں خوبصورت شاہکار بنائے جارہے ہیں۔ یہ فن پارہ اسی منصوبہ کی توسیع ہے۔ سب سے پہلے پوری دیوار پر سفید روغن پھیرا گیا اور ڈیزائن کی حدود کھینچی گئیں، اس کے بعد پلاسٹر کو لیپا گیا اور اس پر احتیاط سے ڈھکن چپکائے گئے کہ دور سے کسی صورت یا ماحولیاتی تصور کو واضح کرسکیں۔ فن پارہ میں مکاؤ طوطوں کو ان کے قدرتی ماحول میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سورج مکھی کے پھول، سبز پہاڑیاں اور دیگر چھوٹے بڑے ماحولیاتی عناصر دکھائے گئے ہیں۔ ویز ویلا میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا فن پارہ ہے جو عوام میں ماحولیاتی شعور اجاگر کرنے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ (منصف، حیدرآباد، ص ۳، ۱۵/مارچ ۲۰۲۰ء)

''طویل ترین سائفنوفور کی دریافت''

امریکہ میں واقع ''شمٹ اوشن انسٹی ٹیوٹ'' کے ماہرین نے سمندر کی گہرائی میں تیرنے والا دنیا کا سب سے طویل رسی نما جانور دریافت کیا ہے۔ یہ ایک طرح کا نیم شفاف سمندری کیڑا ہے۔ کورال (مونگا) یا مرجان کی طرح اس کا جسم چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کو تنگ سمندری گڑھے میں دھاگے کی طرح تیرتے دیکھا گیا ہے۔ اس کی لمبائی ۴۵ میٹر کے قریب ہے۔ درحقیقت چھوٹے چھوٹے اجزا مل کر اس عجیب جانور کی تخلیق کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کی لمبائی ۱۳۰/فٹ تک پہنچ جاتی ہے اور موٹائی جھاڑو کے ڈنڈے کے برابر دکھتی ہے۔ واضح رہے کہ سائفنوفور سمندری مخلوق ہائیڈروزوا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب تک ان کی ۱۷۵/سے زائد اقسام دریافت کی جاچکی ہیں۔ یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ یہ جنسی عمل کے بغیر اپنی تعداد بڑھاتے رہتے ہیں۔ اسی ٹیم نے روبوٹ کی بدولت سمندر کی گہرائیوں میں اور بہت سے عجیب وغریب جاندار، مونگے اور مرجان کی چٹانیں بھی دریافت کی ہیں۔ ان میں شیشے جیسے شفاف اسفنج بھی دیکھے گئے ہیں اور جو پہلی بار کیمرہ میں فلم بند کیے گئے ہیں۔ (انقلاب، وارانسی ایڈیشن، ۲۵/اپریل، ۲۰۲۰ء، ص ۸)

(ک۔ص۔اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب رامپور

۲۴ر فروری ۲۰۲۰ء

مکرمی! سلام مسنون

اکتوبر ۲۰۱۹ء کے معارف میں طب یونانی کی لاثانی شخصیت حکیم محمد اعظم خان رامپوری کی فقید المثال تالیف ''اکسیر اعظم'' پر حکیم شفقت اعظمی صاحب کا مقالہ پڑھ کر یک گونہ مسرت ہوئی۔ میں حکیم صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے گمنام مسیحائے وقت کے حالات وکارناموں پر روشنی ڈالی، باوجودیکہ حکیم محمد اعظم خاں کی شخصیت اور علمی کارناموں کا صحیح طور پر ابھی تک تعارف نہیں ہو پایا ہے، جس کی وجہ سے ان کی شخصیت ابھی تک گمنامی کے پردہ میں مقید ہے۔

حکیم شفقت صاحب نے ان کے دو اساتذہ مولوی عبدالرحیم خاں اور مفتی شرف الدین کا رسمی ذکر کیا ہے۔ حقیقتاً یہ دو حضرات انیسویں صدی میں کامل الفن استاذ کی حیثیت رکھتے تھے، مولوی عبدالرحیم افغانستان کے علاقہ تیراہ سے دہلی آئے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مشہور عالم مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ حدیث کی سند انہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے عطا فرمائی تھی۔ علم ہیئت میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ فراغت علم کے بعد رامپور آئے اور مشرقی علوم کی مشہور عالم درس گاہ مدرسہ عالیہ میں مدرس ہوئے۔ ۱۸۱۸ء میں وفات پائی۔

حکیم صاحب کے دوسرے استاذ مفتی سید شرف الدین علوی پنجاب سے رامپور آئے اور مدرسہ عالیہ کے اساتذہ میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ مولوی عبدالقادر خاں نے اپنے روزنامچہ ''علم و عمل'' میں لکھا ہے کہ میں نے ان سے جو کچھ بھی پڑھا ہے اس کے اعتراف میں اگر فن افتا میں انہیں ابو یوسفِ زمانہ کہوں تو بے جانہ ہوگا، ان کے فتاویٰ اور دیگر تصانیف قلمی صورت میں رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں، ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔

حکیم محمد اعظم خاں کی رامپور سے ہجرت کی وجہ نواب احمد علی خاں (متوفی ۱۸۴۰ء) کی سرد مہری اور عیش کوشی تھی۔ رامپور کا یہ چوتھا نواب والیانِ اودھ کی خطرناک ریشہ دوانیوں کا شکار رہا۔ ۴۶ سال کے طویل دور حکومت میں اس شخص کو سوائے سیر وشکار اور عیش وعشرت کے کچھ یاد نہیں رہا۔

حتیٰ کہ انتظام ریاست بھی نواب نصر اللہ خاں کے سپرد کر دیا جنھوں نے اپنی نااہلی کے باعث ریاست کو سو برس پیچھے کر دیا۔اسی دور میں حکیم اعظم خاں جیسے لاتعداد لوگ رامپور سے ہجرت کر کے دوسرے رجواڑوں میں جا بسے اور قدر و منزلت پائی۔

رامپور میں حکیم صاحب کا آبائی محلہ اور تعمیر کردہ مسجد آج بھی محلہ پنجابیان میں واقع ہے۔ حکیم صاحب کے خاندان کی چھٹی پشت میں مشہور سرجن ڈاکٹر شارق اعظم خاں (آرتھوپیڈک سرجن) اس وقت نمایاں حیثیت کے حامل فرد ہیں۔ڈاکٹر شارق سے پہلے کی نسل میں حکیم اعظم خاں صاحب کے اردو اشعار کا مجموعہ حکیم صاحب کے نام مختلف والیانِ ریاست کے خطوط اور فارسی میں رقم کردہ نسخہ جات کا اہم ذخیرہ محفوظ تھا جس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔خوش قسمتی سے ان چیزوں کا کچھ حصہ مجھے مل گیا تھا جو اس وقت میرے ذخیرے میں محفوظ ہے۔

ضرورت ہے کہ محمد اعظم خاں پر ہندوستان کے کسی طبی ادارہ میں مفصل تحقیقی کام کرایا جائے، ان کی تصانیف کو فارسی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کرا کر شائع کیا جائے تب ہی ہندوستان کی طبی تاریخ میں ان کا صحیح مقام و مرتبہ متعین ہو سکے گا۔

(جناب) ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی

ایڈیٹر ماہنامہ ضیائے وجیہ، رام پور

مکتوب بہار

استھانواں (بہار)

۳/ مارچ ۲۰۲۰ء

مکرمی مدیر صاحب! السلام علیکم

دارالمصنّفین نے قدیم وجدید کتابوں کی عمدہ اشاعت نو کا جو آغاز کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی، وہ قابل مبارک باد ہے، حال ہی میں ایک نئی کتاب ”مسلمانوں میں مطالعۂ مذاہب کی روایت“ از پروفیسر سعود عالم قاسمی نہایت اہم اور معلومات افزا ہے، اسی موضوع پر میں ایک دوسری اہم کتاب تاریخ صحف سماوی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، معارف ۱۹۲۸ء کے فروری کے شذرات میں علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم سے اس کتاب کا ذکر ملتا ہے جس میں مصنف کتاب کی طرف سے

دارالمصنّفین کو اس کا حق اشاعت دیے جانے کا ذکر ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

"ہمارے دوست دارالمصنّفین کے رکن انتظامی پروفیسر نواب علی صاحب ایم، اے (بڑودہ) کی ایک مشہور تصنیف تاریخ صحف سماوی ہے جس میں تمام آسمانی صحیفوں کا انھوں نے موازنہ اور مقابلہ کیا ہے، موصوف نے ازراہ کرم فرمائی "اس کے تمام حقوق دارالمصنّفین کو عطا کردیے ہیں"۔

کیا ہی بہتر ہو کہ یہ کتاب بھی یہاں سے شائع ہو اور مطالعۂ مذاہب کی اس روایت کو مزید آگے بڑھایا جائے۔

نیازمند

(جناب) طلحہ نعمت ندوی

مکتوب مظفر پور

بی۔آر۔اے، بہار یونیورسٹی

مظفر پور۔(بہار)

۱۱/مارچ ۲۰۲۰ء

مکرمی! سلام ونیاز

موقر ماہنامہ "معارف" شمارہ فروری ۲۰۲۰ء کے شذرات کو بہت توجہ اور انہماک سے پڑھا، آپ نے حالاتِ حاضرہ (شہری ترمیمی ایکٹ سے پیدا شدہ حالات) پر بڑا متوازن اور بصیرت افروز تبصرہ فرمایا ہے۔ مبارکباد! شذرات کے آخر میں (ص ۸۴/د) ایک مقام پر میری نظر ٹھہر گئی، آپ نے اردو کے ایک بہت ہی معروف ومقبول شعر ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کو رام پرساد بسملؔ سے منسوب کیا ہے، جب کہ یہ شعر شاہ محمد احسن بسمل عظیم آبادی کا ہے۔ اکثر اردو والوں سے اس سلسلہ میں شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر تسامح ہوتا رہا ہے۔ ماضی میں اچھی خاصی بحثیں بھی ہو چکی ہیں۔ یہ غزل بسمل عظیم آبادی کے شعری مجموعہ "حکایت ہستی" میں صفحہ ۱ تا ۳ پر موجود ہے جو انٹرنیٹ پر بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ پوری غزل اس طرح ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اے شہید ملک وملت، میں ترے اوپر نثار
لے تری ہمت کا چرچا، غیر کی محفل میں ہے

وائے قسمت پاؤں کی، اے ضعف کچھ چلتی نہیں
کارواں اپنا ابھی تک پہلی ہی منزل میں ہے

رہ روِ راہِ محبت، رہ نہ جانا راہ میں
لذتِ صحرا نوردی، دوریٔ منزل میں ہے

شوق سے راہِ محبت کی مصیبت جھیل لے
اک خوشی کا راز پنہاں، جادۂ منزل میں ہے

آج پھر مقتل میں قاتل کہہ رہا ہے بار بار
آئیں وہ شوقِ شہادت، جن کے جن کے دل میں ہے

مرنے والو آؤ، اب گردن کٹاؤ شوق سے
یہ غنیمت وقت ہے، خنجر کفِ قاتل میں ہے

مانعِ اظہار تم کو ہے حیا، ہم کو ادب
کچھ تمہارے دل کے اندر، کچھ ہمارے دل میں ہے

میکدہ سنسان، خم الٹے پڑے ہیں، جام چور
سرنگوں بیٹھا ہے ساقی، جو تری محفل میں ہے

وقت آنے دے دکھادیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیوں بتائیں، کیا ہمارے دل میں ہے

اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ وہ ارماں کی بھیڑ
صرف مٹ جانے کی اک حسرت دل بسملؔ میں ہے

یہ غزل اردو اکاڈمی دہلی کے ترجمان ''ایوان اردو'' شمارہ نومبر ۱۹۹۰ء کے آخری صفحہ پر ''سرودِ رفتہ'' کے عنوان کے تحت بسمل عظیم آبادی کے نام سے ہی شائع ہوئی ہے۔ اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر سید محفوظ الحسن گیاوی نے بھی اس سلسلے میں بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''بسمل عظیم آبادی کی یہ غزل قاضی عبدالغفار کے ''صلاح'' میں ۱۹۲۳ء سے پہلے شائع ہوچکی ہے۔ اس غزل کی تحقیق کے سلسلے میں عزائم ۱۹۷۴ء، عظیم آباد اکسپریس ۱۹۷۵ء اور پھر ''ہماری زبان'' دہلی میں مختلف مراسلے، مباحثے اور مفصل مضامین شائع ہوچکے ہیں۔ مزید تفصیل تسلی اور اطمینان کے لیے ''ہماری زبان'' دہلی کا ۱۵/اگست ۱۹۸۷ء کا شمارہ دیکھا جاسکتا ہے، جس کے آخری صفحہ پر ابومحمد شبلی کا ایک مضمون ''قاضی عبدالودود اور تحقیق ایک غزل کی تحقیق کے پس منظر میں'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس کا مطالعہ کر کے ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاسکتا ہے''۔
>
> (بحوالہ تفہیم وتنقید، ص ۶۰)

مشہور کالم نگار جناب فاروق ارگلی ''یہ للکار بسمل عظیم آبادی کی تھی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"عظیم مجاہد آزادی، شہید وطن پنڈت رام پرساد بسمل سے منسوب یہ شاہکار شعر اب قومی آزادی کا حصہ بن چکا ہے، بالعموم یہی کہا جاتا ہے کہ یہ پنڈت رام پرساد بسمل کی تخلیق ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے خالق اردو کے معروف شاعر سید شاہ احسن بسمل عظیم آبادی تھے، جنہوں نے ۱۹۲۱ء میں یہ شہرۂ آفاق غزل کہی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب تحریک آزادی کا فیصلہ کن مرحلہ شباب پر تھا۔ یہ لافانی شعر جس غزل کا مطلع ہے وہ غزل علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسالہ صباح میں شائع ہوئی اور بجلی کی لہر کی طرح مجاہدین آزادی کی آواز بن گئی، خاص طور پر غزل کا مطلع تو ہماری پوری تحریک آزادی کے طاقتور نعرے کی حیثیت اختیار کر گیا، مذکور ہے کہ بسمل عظیم آبادی نے معرکۃ الآرا انقلابی غزل ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے پٹنہ اجلاس میں پڑھی تو ہزاروں کا مجمع جوش اور ولولے سے سرشار ہو گیا"۔ (بحوالہ روزنامہ راشٹریہ سہارا اسپیشل، مورخہ ۱۰رمئی ۲۰۱۹ء)

"حکایت ہستی" میں آغاز کتاب سے پہلے یہ بیان بھی ملتا ہے:

"یہ غزل رام پرساد بسمل کی زبان پر ہر وقت رہتی تھی، ۱۹۲۷ء میں سولی پر چڑھتے وقت بھی یہ غزل ان کی زبان پر تھی، بسمل کے انقلابی ساتھی جیل سے پولیس کی لاری میں جاتے ہوئے، کورٹ میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوتے ہوئے اور لوٹ کر جیل آتے ہوئے ایک سُر میں اس غزل کو گایا کرتے تھے"۔

اگر آپ مناسب سمجھیں تو معارف کے آئندہ شمارہ میں شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

(ڈاکٹر) فاروق احمد صدیقی

مظفر پور (بہار)

موبائل: 9835660835

معارف: اس بحث میں ڈاکٹر صغیر افراہیم کا وہ مضمون جو کتاب دانش سہیل میں شامل ہے وہ بھی تحقیق کی ایک نئی راہ دکھاتا ہے یعنی یہ شعر بلکہ غزل علامہ اقبال سہیل کی ہے، ڈاکٹر صاحب نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ بھی قابل لحاظ ہیں۔

مکتوب علی گڑھ

۲۷/مارچ ۲۰۲۰ء

مدیر محترم! السلام علیکم مزاج عالی۔

مارچ کا معارف ملا۔اس مرتبہ تمام مشمولات علمی تنوع کی مثال پیش کررہے ہیں۔جناب شریف حسین قاسمی کا مضمون ''فارسی شعرامیں اشتراک تخلص پر مناقشے'' دلچسپ معلومات افزا اور ایک نئے عنوان کی نشاندہی کرتا ہے۔پروفیسر محمد انس حسان نے خانقاہ رائے پور کے جن بزرگوں کی خدمات کا تعارف پیش کیا ہے اسے دلچسپی سے اس لیے بھی پڑھا کہ میرے والد محترم اسی خانقاہ کے بزرگ مولانا عبدالقادر رائے پوری سے بیعت تھے۔''مراسلات معارف'' کا ذکر چھیڑ کر اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا ایک خط نقل کرکے آپ نے معارف کے مخزونہ خطوط کو دیکھنے اور استفادہ کرنے کی طلب بڑھا دی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہر شمارے میں بالاقساط ان خطوط کو شائع کردیا جائے۔شخصی مآخذ میں خطوط سے بہتر ماخذ کیا ہوسکتا ہے۔ان کا حوالہ دراصل شخصی شہادت جیسا ہے۔بیسیوں معاملات میں خطوط فیصلہ کن شہادت بن کر بحث کا حل نکالنے میں معاون بنتے ہیں۔میں نے مرحوم ضیاءالدین اصلاحی کو بھی ان خطوط کی معارف میں بالاقساط اشاعت کی طرف متوجہ کیا تھا،آپ سے بھی استدعا کرتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ یہ دیمک کی نذر ہوجائیں انھیں وقف عام کردیں۔باب التقریظ والانتقاد میں جناب عارف نوشاہی کی شمولیت سے اس کی وقعت میں اضافہ ہوا ہے۔میں نے واٹس ایپ پر انھیں مبارکباد دی تو انھوں نے جواب میں لکھا: ''ایسی تبصرہ نگاری کا فیضان معارف کی روایت ہی سے ملا ہے۔''ہندوستان میں بدلتے سیاسی حالات پر آپ کے شذرات بھی توجہ سے پڑھے جارہے ہیں،انھیں بالیقین مستقبل کی تاریخ کے لیے محفوظ رکھا جائے گا۔رفقا کی خدمت میں ہدیہ سلام پیش کریں۔

مخلص

(جناب) شمس بدایونی

ادبیات

حمد باری تعالیٰ

”وہی وہ ہے“

جناب زاہد جعفری*

تصور کی حدِ بے حد سے بھی اوپر وہی وہ ہے
سرِ منظر، تہِ منظر، پسِ منظر وہی وہ ہے

رگِ جانِ قریں، احساس کے باہر وہی وہ ہے
بدن میں روح ہے اور روح کے اندر وہی وہ ہے

کبھی معصوم بچوں کے ”ارم زار تبسم“ میں
کبھی ممتا کے جذبوں کا امر جوہر وہی وہ ہے

ندیم کنج درویش و چراغ خانۂ مفلس
سکونِ جاں، تسلّیِ دلِ مضطر وہی وہ ہے

درونِ آتش و باد و تراب و آب و کوہ و دشت
بہ جوشِ زم زم و ابر و سرِ کوثر وہی وہ ہے

ہوا، بارش، نظر، خوشبو، تجلی، روح، دل، دھڑکن
ہوالشافی، خطا پوش و کرم گستر وہی وہ ہے

ھواللہ الذی ولا الٰہ الا ھو الحق
حکیم و حاکم و احکم، حکم، داور وہی وہ ہے

نہ حرف و لفظ میں آئے، نہ آوازوں میں وہ اترے
مگر وجدان کے ہر نقطے کا محور وہی وہ ہے

وہی نغمہ طرازِ ساز و سوز ممکناتِ کن
وحی پیغام و قول و نطقِ پیغمبر وہی وہ ہے

قنوت راکع و عابد، قعود ساجد و زاہد
قیام صائم و صالح، جہاں پرور وہی وہ ہے

کرے گا فیصلہ ”یوم تغابن“ جو ہر اک لمحہ
میانِ مومن و کافر سرِ محشر وہی وہ ہے

* جعفر باغ، جلال پور، فیض آباد (یو۔ پی)۔

نعت پاک

☆جناب وارث ریاضی

جنابِ رحمتِ عالمؐ کا جس پر بھی کرم ہوگا
وہ دنیا میں معزز، آخرت میں محتشم ہوگا

نبوت نے کیا ہے آشنا توحید محکم سے
زمانا لاکھ چاہے پرچمِ ایماں نہ خم ہوگا

نبیؐ وہ پیکرِ انصاف ہیں جن کی عدالت میں
کسی کو بھی نہ کچھ اندیشۂ ظلم و ستم ہوگا

جسے نفرت ہے کینہ سے، تعصب سے عداوت سے
نگاہِ سرورِ دیں میں وہ انساں محترم ہوگا

سنے گا جب کوئی دل سے پیامِ محسنؐ انساں
تو ہر پیغام پر اس کا سرِ تسلیم خم ہوگا

وہ منظر دل نشیں ہوگا، نظر کے سامنے جس دم
کبھی وہ گنبدِ خضرا، کبھی بیت الحرم ہوگا

سرِ محشر محمدؐ کی شفاعت کی عنایت سے
نہ رنج بیش و کم ہوگا، نہ عذرِ کیف و کم ہوگا

مجھے پہچان لیں گے حشر کے دن شافعِ محشر
مری لوحِ جبیں پر نام ان کا مرتسم ہوگا

انھی کو ہے شرف حاصل شفیعُ المذنبینؐ کا
کہ ان کے ہاتھ میں عفو و ترحم کا علم ہوگا

مجھے کچھ غم نہیں میدانِ محشر کی تمازت سے
کہ میرے سر پہ وارثؔ سایۂ شاہِ امم ہوگا

نعت

☆☆جناب محمد امین احسن

جاگے ہوئے ہیں آج بھی تیری صدا سے ہم
سرشارِ معرفت بھی ہیں تیری ادا سے ہم

کیوں کر گلہ کریں کہ ہمیں کچھ ملا نہیں
آسودہ ہوگئے ہیں تری خاکِ پا سے ہم

قربان اپنی جان ترے قول و فعل پر
وابستہ ہوگئے ہیں یوں قدر و قضا سے ہم

تیری عنایتوں نے کیا اس طرح اسیر
نزدیک ہوسکے نہ کبھی ماسوا سے ہم

تیرا پیام سارے جہاں کی حیات ہے
کہنا تھا سچ سو کہہ گئے اہلِ جفا سے ہم

حسرت تھی تیری دید کی لیکن خدا کا حکم
پیغام بھیجتے رہے بادِ صبا سے ہم

سارا زمانہ ساتھ تھا جب تیرا ساتھ تھا
پھرتے ہیں اب زمین پہ بے آسرا سے ہم

تیری نگاہِ پاک تری رہبری تمام
صد شکر بچ گئے امیںؔ حرص و ہوا سے ہم

☆کاشانۂ ادب، سکٹا (دیوراج)، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن (بہار)۔ ☆☆بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

اقوال سلف، جلد ہشتم از مولانا محمد قمر الزماں الٰہ آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۶۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد۔ ۶۳۹/بی، وصی آباد، پریاگ راج یوپی۔۲۱۱۰۰۳، اور ممبئی، بھروچ، سورت، دیوبند اور لکھنؤ کے معروف مکتبے۔

امت کے برگزیدہ اور نمائندہ اصحاب علم و فضل و کمال کی باتوں اور زندگی اور دین کے تعلق سے ان کے ذاتی تجربوں، مشاہدوں بلکہ موت وزندگی کی حقیقتوں کے بارے میں جو کچھ کہا اور لکھا گیا اور تذکروں میں ان کو مسلسل بیان کر کے محفوظ کیا گیا، ان سب کا مطالعہ اور پھر ان کا خلاصہ بیان کرنا آسان نہیں، اقوال سلف کے نام سے جب اس مفید اور نہایت کارآمد سلسلہ کا آغاز ہوا تو شاید حضرت مؤلف کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ یہ سلسلہ اس قدر بابرکت ثابت ہوگا کہ پے در پے جلدوں پر جلدیں تیار ہوتی رہیں گی اور صرف اقوال ہی نہیں احوال کے نفع کثیر کا اضافہ بھی کرتی رہیں گی۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی آٹھویں جلد ہے جس میں چودہویں صدی ہجری کے نصف اول تک قریب بیاسی حضرات کے احوال درج ہیں، اقوال بھی ہیں اور کہیں سوانح وارشادات دونوں ہیں، پہلا تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (۱۳۱۳ھ) اور آخری علامہ رشید رضا مصری (۱۳۵۴ھ) کا ہے، فاضل مؤلف کی نظر میں واتبع سبیل من اناب الی اور اولئك الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ کی اصل کلیدیں ہیں، اس لیے یہ کہنا برحق ہے کہ سلف صالحین کی سیرت کو ملحوظ رکھنا ہی ہوگا کہ فوز و کامرانی سے سرفرازی کے لیے ان کی نافعیت کا ہر دور شاہد رہا ہے، مولف محترم نے جو کچھ جمع کیا اور یہ مستند مراجع کی مدد سے جمع کیا، اس کے بارے میں خود ان کو یقین ہے کہ ان اقوال کے اندر عجب عجب علوم و حقائق ہیں اور ان میں عجیب اثر وکیف ہے، ایک بڑی بات یہ بھی ہے کہ محض احوال یا اقوال کو جمع کرنا ہی مقصود نہیں بلکہ ان ہی باتوں کا ذکر کیا گیا جو ایک مسلمان کے دینی اور دنیوی امور میں مفید ہوں، اس لیے زہد فی الدنیا اور دنیا کی خوش حالی سے نفرت یا کسی کے نہایت درجہ بکاء و گریہ زاری یا جسمانی ریاضت کی غیر معمولی حکایت جیسی باتوں سے اس لیے احتراز کیا گیا کہ "ایسا کلام توقیف کا محتاج ہے، اجتہاد کی گنجائش اس میں نہیں ہے اور عقل انسانی کے تصور میں اس کا گزر دشوار مشکل ہے، یہ وہ نکتہ ہے کہ اگر زمانۂ سلف میں بھی اس کا لحاظ کیا گیا ہوتا تو شاید آج حقیقتیں، فسانہ نہ کہلاتیں، مولانا فراہی کے ذکر میں

جہاں یہ سوال اٹھایا گیا کہ ان کا علم زیادہ تھا یا تقویٰ، وہیں ان کی سادگی، بے نیازی، خاموشی، یکسوئی جیسی عادات کو اوصاف حمیدہ سے تعبیر کرنا لطف دے گیا، ان کے متعلق مولانا شبلی کا یہ قول بھی نقل کیا گیا کہ ''حمید کے پاس بیٹھ کر آدمی کا دل دنیا سے اچاٹ ہوجاتا تھا'' لیکن تعجب ہے کہ خود حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی کے ذکر سے صفحات محروم ہیں، غالباً پہلے کسی حصہ میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہو۔ خدا کرے اقوال سلف کا یہ سلسلہ محترم مولف کی زندگی کے ساتھ درازتر ہوتا رہے۔ شروع میں چند بزرگوں کے تاثرات بھی ہیں اور مولوی محبوب احمد ندوی کا پیش لفظ بھی خوب ہی نہیں بہت خوب ہے۔

قرآنیات، از مولانا نعیم الدین اصلاحی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۴۰۰، قیمت ۴۹۰ روپے، پتہ: ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، ایف۔۱۵۵، فلیٹ نمبر ۲۰۴، ہدایت اپارٹمنٹ، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔۲۵ اور دہلی وحیدرآباد کے معروف مکتبے۔

قریب بیس بائیس مضامین ہیں اور یہ سب قرآن مجید کے مطالعہ اور غوروفکر کی برکت سے پڑھنے والوں کے لیے قرآن مجید کی بلاغت وفصاحت اور مطالب کی وسعت سے آشنا کرتے ہیں، تزکیۂ نفس، تکریم انسانیت، فلسفہ عروج وزوال، فساد فی الارض، اسلامی ریاست، مرتبۂ نسواں جیسے موضوعات کے ساتھ قرآن مجید کی تدوین کا مکی نظام، غزوۂ بدر، بعض مقامات قرآن، اولین مکی سورتیں جیسے عنوانات بھی ہیں، مولانا فراہی، مولانا ابوالجلال ندوی، علامہ کوثر ندوی، مولانا جلیل احسن ندوی جیسے قرآنی علماء کی خدمات کا جائزہ بھی ہے، ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی کے چند تفسیری مباحث کا موضوع بھی چونکا دینے والا ہے۔ فاضل مصنف نے قرآن مجید کے خدمت گزاروں کو ''شہیدانِ وفا'' کا نام دیا ہے اور اپنی تحریروں کو تحقیقی و علمی کہنے سے انکسارانہ گریز کیا ہے، حالانکہ وہ ان خوش بختوں میں ہیں جن کو قرآن مجید کے درس وتدریس کی نعمت عطا ہوئی ہے، اسی لیے ان کی تحریروں میں کہیں متعلمانہ تو کہیں معلمانہ، کہیں عالمانہ تو کہیں خطیبانہ جھلکیاں مطالعہ کا پس منظر روشن کرتی نظر آتی رہتی ہیں، فکری لحاظ سے وہ مولانا فراہی، مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی سے متاثر ہیں اور اس مجموعہ میں تو یہ فکر استشہادات و اقتباسات کی شکل میں زیادہ ہی عام ومنتشر ہے، ویسے جابجا وہ دوسرے مفسرین جیسے مولانا دریابادی، مولانا کوثر ندوی اور سید قطب سے بھی اکتساب فیض میں کم نہیں، واذکر عبدنا داؤد کے ضمن میں لکھا گیا کہ ''اللہ کی زندگی کے وصف سے کسی کو متصف کیا جانا اسے غایت درجہ شرف وفضیلت عطا کرتا ہے''،

عبدنا سے اللہ کی صفت زندگی کس طرح ثابت ہوگئی؟ اس کی وضاحت ہوجاتی تو بہتر ہوتا، انفروا خفافا وثقالا کی بحث میں فاضل مصنف کو شکوہ ہے کہ ہمارے مترجمین ومفسرین راہِ صواب سے ہٹ گئے، یہاں وہ انفرادی تفسیری کوششوں کی جگہ باحثین ومحققین کی ایک ایسی جماعت کو زیادہ مناسب سمجھتے ہیں جو متفق الفکر اور متفق النظام ہو کر قرآنی مفہوم ومدعا کو حتمی شکل دے، فاضل مصنف کی تحریروں میں نظم قرآن ونظام قرآن کا ذکر بار بار آیا ہے اور یہ مولانا فراہی ومولانا مودودی کی شناخت کے طور پر ہے۔

ارباب نظر، از پروفیسر عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر ایس اقبال قریشی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۲۰۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: اقبال اکیڈمی انڈیا، سی۔آئی۔ایس۔آر۔ ایس ہاؤس، ۱۴۔بی، جنگ پورہ، متھرا روڈ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۱۴۔

ایک صاحب نظر کی نظر میں اگر ایسی شخصیتیں آجائیں جن کو ارباب نظر سے تعبیر کیا جائے تو دیکھنے والے کی نظر کو دیکھنا شاید سب سے دلچسپ مرحلہ ومشغلہ ہو، پروفیسر عبدالحق کی تحریروں میں سوز وساز آرزو اور قلب ونظر کے اضطراب بلکہ شورشوں کا شور ہے اور یہ یقیناً اس سحر کا اثر ہے جو اقبال کے کمال کی صورت میں خود پروفیسر صاحب کی تحریروں کو جلال وجمال عطا کرتا ہے، وہ عقیدت اقبال کے اس مقام پر ہیں جہاں کسی بھی انسانی ذہن کی وسعت کو وہ اقبال کے کلام کا کرشمہ تصور کرتے ہیں، یہ کتاب بھی سحر انگیز ہے، ذکر یار مہرباں کے بعد بظاہر یہ ان شخصیتوں کے تعلق سے تاثرات حق ہیں جن کی لذت آشنائی لکھنے والے کو عجب لطف بخش گئی، ان شخصیتوں میں کلیم الدین احمد، پروفیسر محمود الٰہی، قاضی عدیل عباسی اور اقبال سہیل ہیں تو حکیم اجمل خان، مولانا حفظ الرحمٰن جیسے بزرگ بھی ہیں، کچھ ہم زمانہ بھی ہیں جیسے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر ریاض مجید وغیرہ، سب اپنی شناختوں کے اعتبار سے متفرق ومتضاد، مگر ایک رشتہ اقبال ہے جس کی مدد سے فاضل مصنف کی تسبیح کا ہر دانہ ایک دوسرے کا ہم زبان بنتا جاتا ہے، پروفیسر کلیم الدین احمد کے بارے میں یہ مخفی نہیں کہ اقبال کا بیان ان کے یہاں تنقید وتنقیص کا فرق مٹاتا نظر آتا ہے۔ فاضل مصنف کو جب کلیم الدین کی اقبال شناسی کا موضوع بخشا گیا تو واقعی یہ غلط بخشی ہی تھی جو آزمائش میں مبتلا کرنے والی تھی لیکن جب سوچ یہ ہو کہ تنقید بہر حال تخلیق کی حریف نہیں ہوسکتی، کیونکہ کار تنقید تو باعث تشویق یا تنصیف ہے، یہ بجائے خود نہ ہدف ہے نہ تیر، اسی وجہ سے فاضل مصنف کے سامنے یہ نکتہ حق آیا کہ بڑا انقاد بننے کے لیے لازمی ہے کہ اقبال کو

موضوع سخن بنایا جائے، کلیم الدین نے خارہ تراشی کی تو خارہ گدازی بھی، بس یہی وہ نکتہ تھا جس نے زبان حق سے کہلا دیا کہ کلیم الدین احمد کا حالی و شبلی کے بعد اب تک کوئی حریف یا حلیف پیدا نہ ہوسکا، مصنف دربار اقبال کے نقیب خاص ہیں لیکن نقارۂ شبلی ہمیشہ ان کے ہاتھوں میں نظر آتا ہے، بات عدیل عباسی کی مناسبت سے خطہ شیراز ہند کی چھڑی تو یہ جملہ قلم کی رفعتوں کو سلام پیش کرگیا کہ سو سال سے جریدۂ عالم کی جبین نیاز خالی ہے، شبلی و اقبال کا نقش ثانی تو کجا دور کی نسبت رکھنے والے بھی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک بن کر رہ گئے، مولانا شبلی کی وفات پر اقبال نے شبلی کو امام الہند والانژاد شبلی طاب ثراہ کہا، یہ قول ایک فکری اقتدا کی دستاویز ہے، اقبال نے ہند کے بیچارے اماموں میں دو کا انتخاب کیا، ایک رام چندر جی دوسرے شبلی، کیوں؟ جواب کے لیے اقبال کے درون کی تلاشی لینی ہوگی۔ پروفیسر محمود الٰہی، صاحب کتاب کے استاد تھے اور استاد کے محصولات کی میزان شاگرد رشید سے بہتر کون بیان کرسکتا ہے، میزان یہی کہ استاد کی پرورش و پناہ میں کیسے اور کتنے افراد کو پناہ ملی، شاید ہی محمود الٰہی مرحوم کے متعلق کسی نے یہ کلمۂ حق بلند کیا ہو کہ وہ اپنے وجود میں ایک مخصوص موثرات کی تربیت گاہ تھے، ان کی رہ کہکشاں میں کیسے کیسے علمی چراغ فروزاں ہوئے، اس میں کوئی استاد ان کی ہمسری کا مدعی نہیں ہوسکتا، بظاہر یہ مبالغہ آمیز دعویٰ ہے لیکن دلائل جو پیش کیے گئے وہ اپنی جگہ برحق، انسان تو وہی جو پیکر ایثار اور دردمند دل کا مالک ہو جو ہوس سیر و تماشا سے بے نیاز ہو، جس کی فکر و نظر میں اعتدال پسندی رچی بسی ہو، محمود الٰہی مرحوم کے احسانات میں ایک سچے شاگرد کی طرح یہ کہہ دیا کہ ''ان ہی کے فیض سے اقبالیات سے شوق پیدا ہوا وہ پیرہن کے تار تار میں بوئے دوست بن کر حیات کا حاصل بن گیا، یہ مضمون بہت کچھ کہہ جاتا ہے کہ ہمارے تذکروں میں متقین و صالحین کے کیسے کیسے گوشے خاص کرلیے گئے، صنم تراشے گئے اور رنگ و روغن نے آنکھوں کو خیرگی سے دوچار کردیا ورنہ کتنے ایسے ہوئے کہ در شاہنشاہی فقیری کردہ ای۔

یہ مختصر سی کتاب جسے تذکرہ رجال اقبال بھی کہہ سکتے ہیں اس کا مطالعہ عجب نشاط انگیز ہے، اقبال سہیل کا ذکر آیا تو اس شان سے کہ وہ اپنے دور انحطاط کے پروردہ تھے اور پشیمان بھی......وہ بے خبر اور بے حس بھی نہ تھے کہ تقدیر الٰہی پر تکیہ کرکے خانقاہ میں پناہ نشینی کے بہانے فرار ہوجاتے، کتاب کے مرتب کو جزائے خیر و احسن ملے کہ انہوں نے ایسی جاں فزا تحریروں کو جمع کیا اور اس شعور کے ساتھ جمع کیا کہ یہ تحریریں تنقید، تاثر، تحریک اور تشخص کا عطر مرکب ہیں اس میں تبحر بھی شامل کرلیجیے اور یہ نکتہ کی

بات بھی کانوں میں ڈال دی کہ اردو کی معاصر تنقیدی تحریروں میں ایسی شگفتگی اور دلکشی نظر نہیں آتی، اقبال کے اس مصرعہ کو دیکھیے کہ ؎

یک لحظہ بدل درشو شاید تو درآئی

اور اب یہ جملہ ملاحظہ ہو کہ ''اقبال کی دروں بینی کی دریابی آسان بھی نہیں، اس کے لیے دردمندی درکار ہے''، رشید احمد صدیقی یاد آئیں یا نہ آئیں، دال کی دلداری داد طلب ہے۔

دکن دیس کی پیش روغزلیں، از جناب اسلم مرزا، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۸۴، قیمت ۲۷۵ روپے، پتہ: مرزا ورلڈ بک، حمید کامپلکس، جنسی روڈ، قیصر کالونی، اورنگ آباد، مہاراشٹر-۴۳۱۰۰۱ اور ممبئی، علی گڑھ اور حیدرآباد کے دوسرے مکتبے۔

کتاب کی ابتدا ہی میں لعل چند رنگین اورنگ آبادی کا ایک شعر دیا گیا ہے کہ سخن رنگین کی خواہش جس کے دل میں ہوگی وہ اگر شمال سے دکن کا سفر کرلے تو حیرت نہیں، اس کتاب میں رنگین جیسے سو سے زیادہ شعرا جن کا تعلق سولہویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی تک ہے، ان کی غزلوں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اس کام یا کارنامہ کے لیے جس دیدہ ریزی، تلاش اور تحقیق اور پھر موجودہ قارئین کے لیے تشریح و تسہیل کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا حق جس طرح ادا کیا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کا اندازہ اصل کتاب کے دیکھنے ہی سے ہوسکتا ہے، فاضل مرتب کے قلم نے دکنی تحقیقات کے چمن میں پہلے بھی ایسے گل بوٹے کھلائے ہیں جن سے اردو ادب میں ایک نئی فصل بہار کا اضافہ ہوا ہے، اس کتاب میں بھی بیجاپور اور گولکنڈہ کے علاوہ آصف جاہی عہد کے شعرا بھی نظر آتے ہیں، کتاب کے مقدمہ نگار ڈاکٹر اشفاق انجم نے شرح و بسط سے ان غزلوں کی اہمیت کو اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا سے جوڑ کر اعلان کردیا کہ اردو نے دکن ہی میں آنکھیں کھولی ہیں، یہ اور اردو کی ابتدا سے متعلق دوسری رائیں ہیں، بحثیں بھی ہیں اور پھر ان کے ردو ابطال کے دلائل بھی ہیں، مگر یہاں فاضل مقدمہ نگار نے بڑی قطعیت سے کہہ دیا کہ ''شمال ہند کے محققین و ماہرین لسانیات، باقاعدہ ایک منصوبہ بند طریقے سے اسے شمالی ہند کی پیداوار بتانے پر مصر ہیں''، ظاہر ہے اس قطعیت میں زور قطع تعلق کا بہر حال نہیں ہے، اس لیے یہ تسلیم کرنے میں عقیدہ کی کمزوری نہیں کہ کتاب میں شامل پیش روغزلیں اردو ہی کی ہیں اور یہ دکنی زبان میں اردو کی اصل اور جڑ ہیں''، باقی غزلوں کا لطف تو اب شاید دکن والوں ہی کے لیے مشکل

ہی ہو،تشریح اور تسہیل سے مضامین سخن کی سمجھ اور چیز ہے، جو قدیم کو بہر حال تقدس عطا کرتی ہے، سراج اورنگ آبادی کی نہ جنوں رہا نہ پری رہی والی غزل تو ہمیشگی کی ایسی صفت سے مالا مال ہے کہ اردو اور دکن والوں کو ابدیت عطا کر جاتی ہے، ڈاکٹر راہی فدائی نے صحیح کہا کہ یہ کتاب لسانیات کے ماہرین کے لیے غور و فکر کا منبع و ماخذ ثابت ہوگی۔

سر سید احمد خاں (وضاحتی موضوعاتی کتابیات)، جلد اول از ڈاکٹر عطا خورشید، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۴۸، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: علی گڑھ ہیریٹیج پبلی کیشنز، ۴/۱۷۰۶، مزمل کمپاؤنڈ، دودھ پور، علی گڑھ-۲۔

کسی مصنف کی کتب و مضامین شماری کا علم بلکہ فن بجائے خود ایسی شے ہے جس کے لیے دیدۂ حیراں اور زبان مدح خواں کے علاوہ اور کچھ بن نہیں آتا اور جب معاملہ سر سید جیسی ہمہ گیر شخصیت کا ہو، زمانی بُعد ہو اور تحریروں کی وسعت اور ان کا پھیلاؤ قریب دو صدیوں پر محیط ہو تو ایسی شخصیت کے مضامین، اس سے متعلق مضامین، خطوط، تبصرے، رائیں، اشعار اور وہ بھی سب تاریخی اعتبار سے جمع کرنا، مرتب کرنا، درحقیقت ایک فرد کا کام ہی نہیں لیکن اگر ایسی کرامت کسی صاحب نسبت سے ظاہر ہو تو دل اور سر دونوں عقیدت سے جھک ہی جاتے ہیں، زیر نظر کتاب کو دیکھ کر یہی کیفیت طاری ہو کر رہتی ہے، پروگرام تو یہ تھا کہ سر سید کی تصانیف اور مضامین تاریخی الفبائی اور موضوعی لحاظ سے ترتیب دیے جائیں، اس پروگرام کی پہلی عملی شکل زیر نظر کتاب ہے جس میں سر سید کی اپنی تمام تحریروں کو موضوعی لحاظ سے جمع کیا گیا ہے، فاضل مرتب کی یہ امید قطعی بجا ہے کہ اس فہرست سے سر سید پر کام کرنے والوں کو ایسی مدد ملے گی جس سے تحقیق کی نئی راہیں آسان ہو جائیں گی اور صرف سر سید کیا، مسلم یونیورسٹی بلکہ مسلمانوں کے ہندوستان کے عہد جدید کی تاریخ کے مطالعہ و تحقیق کے کیسے کیسے دشوار گزار راستے بھی ہموار ہو جائیں گے، ایک بات اور اتنا بڑا ہمالیائی کام انجام دینے کے بعد بھی فاضل مرتب نے جس طرح اپنے معاونین کا ذکر و شکر کیا اور کئی کو تو پورا کریڈٹ ہی دے دیا، یہ ان کی ایسی خاکساری کا غماز ہے جو ان کی واقعی اہلیت و صلاحیت کا سچا مظہر ہے اور ہر ایسی کاوش کے احترام کے لیے قاری کو مجبور کر دیتا ہے۔

انحراف ـــــ از جناب یعقوب تصور، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع نہایت حسین و منفرد گرد پوش، صفحات ۱۴۴، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: جاوید انور، اردو آشیانہ-۱۶۷، آفاق خاں

احاطہ،منڈواڈیہہ بازار،وارانسی۔۳۔

شاعر نے دعا کی کہ اس پر دائرہ در دائرہ منظر بہ منظر کھول دیے جائیں،علم کی دہلیز پر اگر وہ دامن کشا ہے تو اس کے مقدر کا در کیوں بند رہے؟ دعائیں تو ہوتی ہیں قبولیت کے لیے،نتیجہ یہ ہوا کہ قطعات کی شکل میں افکار واحساسات نے مضامین کو جدتوں اور ندرتوں کے نئے نئے شامیانے عطا کر دیے،یہ مجموعہ کب کا آیا تھا،برسوں گزر گئے لیکن خوشبو اب تک تازہ ہے،ایک قطعہ ہے:

نئے شالے دوشالے دیکھ لینا یہ جھومر اور جھالے دیکھ لینا
تحائف جب نرالے دیکھ لینا مرے ہاتھوں کے چھالے دیکھ لینا

شاعر نے صنف قطعہ میں کچھ جدتیں بھی کی ہیں یعنی مطلع والی چار مصرعی نظموں کو بھی قطعہ بنا دیا ہے،کتاب وشاعر دونوں کے لیے پروفیسر وہاب اشرفی مرحوم کی وقیع تحریر بڑی سند ہے جس میں کہا گیا کہ انحراف کے قطعات اسے ایک مستقل صنفی حیثیت بخش رہے ہیں جن میں معنی آفرینی کے تمام تر پہلو مخفی ہیں۔

تمہید تمنا،جناب عمران ساغر،متوسط تقطیع،عمدہ کاغذ وطباعت،مجلد مع گرد پوش،قیمت ۲۰۰ روپے،
پتہ:مکتبہ نعیمیہ،مکتبۃ الفہیم،مئومیڈیا سینٹر،مئو۔

غزلوں اور لفظوں کے اس مجموعہ کا عنوان تمہید تمنا ہے،شاعر خود ابھی عمر کے اس دور میں ہے جسے زندگی اور اس کی تمام تمناؤں کا عرصۂ تمہیدی کہا جائے گا لیکن چھوٹی سی عمر میں وہ احساس کے ہر امکان سے دوچار ہو گئے،مسافر سے کب مہاجر بنے؟ خود ان کو بھی پتہ نہیں چلا،کہہ اٹھے کہ ع
اب نہیں فرصت مجھے حالِ دل سنانے کی،اقرار بھی کر لیا کہ:

تباہ کر دیا مجھ کو بڑے سلیقے سے مجھے پتہ بھی نہ تھا اتنا باکمال ہے تو

مئو کے شور انگیز ماحول میں شعر کیسے تیار ہو کر سنور جاتا ہے،دیکھیے:

بس اتنی بات کہ خود کی پریشانی مٹانے کو امیر شہر نے سب کو پریشانی میں رکھا ہے

کوئی بات تو ہے کہ رہبر تابانی دریابادی جیسے استادِ سخن اور امیر حمزہ اعظمی جیسے سخن شناس نے کہہ دیا کہ ساغر میں شعری شعور کے ساتھ انفرادیت کے سنگ میل کو نصب کرنے کا ہنر اور جذبہ ہے۔

(ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

بحر زخار: (جلد دوم) شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی، مترجم مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، کمال بک ڈپو، شمس العلوم، گھوسی (مئو)۔ قیمت ۶۵۰ روپے

بحر زخار: (جلد سوم) شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی، مترجم مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، کمال بک ڈپو، شمس العلوم، گھوسی (مئو)۔ قیمت ۶۰۰ روپے

بخاری شریف کے آخری باب وحدیث کی تشریح: شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، ترجمہ وتشریح مولانا مظہر الاسلام قاسمی، ثاقب بک ڈپو، دیوبند۔ قیمت ۳۰ روپے

تحفۃ المشتاقین: حضرت نذیر احمد رحمانی، ترتیب جدید، پروفیسر مقصود احمد، ۲۰۳، شفا کامپلکس، تاندلجا روڈ، بڑودہ، گجرات۔ قیمت ۳۰۰ روپے

شیئر بازار میں سرمایہ کاری۔موجودہ طریقۂ کار اور اسلامی نقطۂ نظر: ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت ۸۰ روپے

عفو و درگزر (معاف کرنے کے فضائل): ابوطلحہ بنارسی ندوی، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند۔ قیمت ۶۰ روپے

کربلا اور شہیدان کربلا: ڈاکٹر الف ناظم، ویدپرچار منڈل، ہاسپٹل بازار، بٹھنڈا، پنجاب۔ قیمت ۱۰۰ روپے

میں اور میری یادیں، میرے سفر: (خودنوشت) کندن لال کندن، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت ۳۰۰ روپے

نشأۃ ثانیہ میں مسلمانوں کا کردار، اسلامی تہذیب کا مطالعہ: احمد عیسیٰ و عثمان علی، تلخیص ایلی سن لیک، مترجم ڈاکٹر فہیم الدین، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز۔ قیمت ۴۰ روپے

نور ہدایت: مولانا حافظ سید عبدالکبیر عمری، مرتبین محمد رفیع کلوری عمری، حافظ محمد ابراہیم عمری، ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ دارالسلام عمرآباد، تمل ناڈو۔ قیمت ۳۵۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) علامہ شبلی وسید سلیمان ندوی	2200/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی) مرتبہ: سید سلیمان ندوی	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
MAY 2020 Vol - 205 (5)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیر الصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-